مونوگراف

وحشت کلکتوی

کلیم حاذق

مونوگراف

وحشت کلکتوی

کلیم حاذق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/82روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1875

Wehshat Kalkatvi

By: Kaleem Hazique

ISBN :978-93-5160-108-1

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسارا پرنٹنگ سسٹمس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلوماتی ذخیرہ کا سبب بھی بن سکے، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

	ابتدائیہ	VII
1۔	شخصیت و سوانح	1
2۔	ادبی اور تخلیقی سفر	27
3۔	تنقیدی محاکمہ	47
4۔	وحشت کی نثر نگاری	65
5۔	انتخاب کلام	85
6۔	کتابیات	140

ابتدائیہ

بنگال کی شاعری اور ادب جن شخصیات کے حوالے سے اردو کی ادبی تاریخ میں متعارف ہے، ان میں فورٹ ولیم کالج والے میر امن اور ان کے معاصرین، انتخابِ نقص والے عبدالغفور نساخ اور ان کے شاگرد عظمت اللہ انسخ جنھوں نے طومارِ اغلاط لکھ کر اہلِ لکھنؤ سے پنجہ لینے کی جسارت کی۔ یہاں تک کہ مولانا عبدالباری آسی نے آتش کے شعر پر انسخ کی گرفت کو درست قرار دیا۔ آمدن برسرِ مطلب اپنی ادبی سرگرمیوں سے مزین بنگال کی سرزمین نے بیسویں صدی کے اوائل میں جس شخصیت کی وجہ سے اردو کے بڑے شعرا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، ان میں اوّلین نام علامہ رضا علی وحشت کا ہے۔ وحشت عموی طور پر اتباعِ غالب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وحشت نے خود ہی عرض کیا ہے۔

وحشت ہمیں تتبعِ غالب ہے آرزو
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

غالب کہتا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کی دشواری بھی آسانی میں ہے لیکن شعر کی طرح داری آسان کو مشکل اور مشکل کو آسان بنا رہی ہے۔ اس کی نوعیت بھی آفاقی ہے۔ ادھر غالب کے تتبع کی آرزو کرنا وحشت کے لیے دشوار نہیں تھا تاہم بات آرزو کی حد تک نہیں رہ گئی اور وحشت نے اپنا پورا دیوان شائع کر دیا جس پر حالی جیسے مداحِ غالب نے بھی وحشت کے کلام کی مدح سرائی کی اور اس شرط کے ساتھ کہ غالب کے مخصوص اشعار کو الگ کر دیا جائے تو بلا مبالغہ کلامِ وحشت کو غالب کا تتبع قرار دیا جا سکتا ہے۔ دراصل وحشت کو اہلِ نظر کا خراج عقیدت تھا۔ ظاہر ہے یہ رائے بھی ایسی ہی ہے جیسی جگر کے زمانے میں جگر کی مقبولیت! لیکن وحشت کی غالب نوائی سے اردو شاعری کو کیا فیض پہنچا اس پر گفتگو بے حد کم ہوئی ہے۔ یہاں میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا چلوں کہ غالب نوائی یا پیروی غالب سے میری مراد غالب کے اسلوب اور اندازِ بیان کی کشش ہے جو شعر کے معنیاتی نظام کو سنبھالے رکھتا ہے اور اسے ایک آفاقی حیثیت عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے غدر کے زمانے میں غالب کے ہم عصر کم نہیں تھے لیکن واقعہ کو شعر بنانا سب کے بس کی بات نہیں۔ غالب کو ایسے اشعار بنانے میں مہارت تھی جو تا دیر قائم رہیں اور مختلف واقعاتی حوالے سے دہرائے جائیں۔ یہاں اس بات سے یہ مطلب نکالنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ دوسرے بڑے شعرا میں ایسی خوبیاں نہیں ہیں بلکہ اردو کا ہر وہ شعر جو زمانی اور مکانی حد بندیوں سے ماورا ہے، ہمارے تخیل کے دروازے کھولتا ہے۔ اگر غور کریں تو وہاں لمحۂ موجود شعر میں ڈھل کر حصارِ وقت سے آگے نکل جاتا ہے۔ اب اگر اپنے شعر میں کوئی یہ مصرعہ باندھے کہ ''حصارِ وقت سے آگے نکل گیا ہوں میں'' تو آپ اسے واقعہ ہی سمجھ لیجیے جو شعر بننے سے کوسوں دور ہے بشرطیکہ دوسرے مصرعے میں اس کا تخلیقی جواز موجود نہ ہو۔ اس موڑ پر رضا علی وحشت کی کلامِ غالب سے ذہنی ہم آہنگی اہم بات ہے، لہٰذا بنگال کی غزلیہ شاعری میں جو فکر انگیزی کی بالادستی ہے، اس میں کلامِ وحشت کا حصہ ضرور ہے۔ یہاں مجھے ایک دلچسپ جملہ یاد آ رہا ہے کہ ''اردو شاعری وہ بیل ہے جو قریب کی دیوار پر چڑھتی ہے''۔ وحشت کے معاملے میں یہ دیوار نہ صرف بلند تھی بلکہ دور بھی!

واقعہ ہے کہ رضا علی وحشت نے جب شعر گوئی کی ابتدا کی، اس وقت عظیم آباد سے کلکتہ تک داغ دہلوی کا رنگ بہتوں پر غالب تھا۔ خود وحشت کے استاد ابوالقاسم شمس داغ کے شاگرد

تھے۔ان کی شاعری کم وبیش داغ کے رنگ سے مستفید نظر آتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغ اور امیر کی شہنائی خوب بج رہی تھی۔ دوسری طرف اردو نظم اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔اس عالم میں اقبال مل گئے۔اقبال تک نظم نگاری کی مختلف النوع کونپلیں پھوٹ چکی تھیں اور جدید ذہن نظم کے پیراہن کو پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں وحشت کا دامنِ غزل کا امیر ہونا انھیں غزل کے احیا کار شعرا کی صف میں باوقار مقام عطا کرتا ہے۔ اردو کی ادبی دنیا، اصغر، حسرت، یگانہ، فانی کے ساتھ اگر وحشت کا نام نہیں لیتی ہے تو نہ ہی یہ فہرست مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی غزل کی ہیئت میں اسلوب وفکر کی رنگارنگی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے کلامِ وحشت کا مطالعہ ہمیں بابِ غزل کے لیے کچھ نئے مواد فراہم کرسکتا ہے۔شاید وحشت کی بھی یہی آرزو تھی۔

ہم بھی تھے جوہرِ گراں مایہ
پر کوئی صاحبِ نظر نہ ہوا

اس مختصر کتاب میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ کلامِ وحشت کو سمجھنے کے لیے ان کی تخلیقات کا ایک انتخاب پڑھنے کو مل جائے تاکہ قارئین براہ راست متن سے فیضیاب ہوکر اپنی کوئی رائے قائم کرسکیں اس لیے کہ دیوانِ وحشت اور ترانۂ وحشت دونوں کتابیں اب نہ صرف کمیاب ہیں بلکہ اوراقِ پارینہ بن گئی ہیں۔ یہ تو بھلا ہو برادرم اشرف احمد جعفری کا جن کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے ترانۂ وحشت اور مضامینِ وحشت کی ایک بوسیدہ جلد فراہم کی۔ رسائل وجرائد مغربی بنگال اردو اکادمی کی لائبریری میں موجود ہے جن سے مجھے بیحد مدد ملی۔ اگر یہ مونوگراف پسند کی گئی تو یہ اطمینان ہوگا کہ ہم نے ایک بار پھر یادِ وحشت تازہ کرلی۔

کلیم حاذق

شخصیت وسوانح

بنگال کا ادبی وتہذیبی پس منظر

سرزمینِ بنگال کی کئی صدیوں پر محیط ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی ایک شاندار تاریخ ہے۔ اس کی نشانیاں بشمول پالی، سنسکرت، فارسی سمیت جدید ہندستانی زبان بنگلہ، اردو، ہندی، سنتھالی و دیگر مقامی بولیوں اور پوتھیوں میں موجود ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس خطے میں عام طور پر بولی جانے والی زبان بنگلہ کی لسانی تشکیل میں سنسکرت، پالی کے ساتھ فارسی اور عربی زبان کی خوش رنگ اور متوازن شمولیت سے اردو اور فارسی کے تئیں بنگال کے شرفا کی نظرِ خاص رہی ہے۔ راجہ رام موہن رائے تا جیوتی بھوشن چاکی اردو، فارسی اور بنگلہ تہذیبی شراکت کی نشانیاں تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ غالب کے دوصد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر نہ صرف غالب کی 250 سے زائد غزلیات کا ترجمہ بنگلہ زبان کے بڑے شعرا بشمول شنکھو گھوش اور بنگلہ لغت نویس اور ناقد جیوتی بھوشن چاکی کی ادارت میں شائع ہوا بلکہ بنگلہ رسالہ دیش نے غالب پر کئی گراں قدر مقالے شائع کیے۔ ان میں جیوتی بھوشن چاکی کا مقالہ اردو بنگلہ لسانی سروکار کے ساتھ میر اور غالب کے کلام سے بنگلہ قارئین کو متعارف کرنے کی ایک سعیِ بلیغ تھی۔ ڈراما اور غزل کے میدان میں اہلِ بنگال کی شرکت سے پیدا ہونے والی مشترکہ تہذیبی اقدار بنگال کی تہذیبی وراثت کی دین ہیں جس

سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو انسان کے اندرون میں بلا تفریق اور غیر محسوس طریقے سے اتر جاتی ہیں جس کی بنیاد جیسا کہ میں نے عرض کیا، صدیوں پر محیط ہے۔

واقعہ ہے کہ بنگال کے کچھ اضلاع مرشد آباد، ڈھاکہ، کلکتہ اور ہگلی گذشتہ 200 برسوں میں فارسی اور اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہے ہیں۔ وحشت کی پیدائش سے ایک سو برس قبل بنگال نشاۃ الثانیہ کے دور سے گزر رہا تھا۔ 1781 میں کلکتہ مدرسہ (مدرسہ عالیہ) جسے اب جامعہ کا درجہ دیا جا چکا ہے اور 1784 میں ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح 10 جولائی 1800 میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی ہندستانی زبانوں کو بھی جدید اطلاعاتی ضرورتوں کے ساتھ جوڑنے کا کام شروع کیا گیا جس کے نتیجے میں بنگال کے نامور ادبا فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے اور تراجم کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس طرح انگریز حکومت نے ہندستانی زبانوں میں لغت نویسی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے روبرو جدید ہندستانی زبانوں کو سرکاری کام کاج کے لائق بنانا شروع کیا۔ اس تگ و دو میں اردو زبان کی نثر شستہ اور رواں ہو گئی کیونکہ کلکتہ کا جو پڑھا لکھا طبقہ تھا، وہ کسی نہ کسی طرح فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ چند برسوں میں ملک کے گوشے گوشے سے اہلِ علم کا قافلہ کلکتہ کی سمت رواں دواں ہونے لگا۔ باغ و بہار والے میر امن دہلوی، آرائشِ محفل والے حیدر بخش حیدری، صاحبِ باغِ اردو (گلستاں کا ترجمہ) میر شیر علی افسوس، گلشنِ ہند والے مرزا علی لطف، اُردو میں کالی داس کی شکنتلا پیش کرنے والے مرزا کاظم علی جواں اور پند نامہ کے مصنف مرزا کاظم علی خاں ولا جیسی شخصیات اردو داستان گوئی، تاریخ نویسی، تذکرے اور اخلاقیات کے مضامین کو مختلف زبانوں سے ترجمہ کر کے اردو نثر کی نوک پلک سنوار رہی تھیں تو دوسری طرف علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کا ایک خوشگوار سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کلکتہ ہی سے پہلی بار 1811 میں مرزا کاظم علی جواں، مرزا جان طپش، محمد اسلم اور منشی غلام اکبر نے مبسوط کلیات میر تقی میر کی اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان (مثنوی بدرِ منیر) کی اشاعت بھی 1803 میں کلکتہ گزٹ پریس میں ہوئی۔ انتخابِ مرزا محمد رفیع سودا بھی 1810 میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ المختصر کلکتہ صرف ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب اور صحافت کا دارالخلافہ بن رہا تھا۔ جدید ٹکنالوجی

نئے اذہان کو متاثر کر رہی تھی۔ مرشد آباد میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریزوں کے لیے کلکتہ ایک محفوظ مرکز بن گیا تھا۔ دکن میں ٹیپو سلطان کی شہادت اور 1806 میں انگریز سامراج کے خلاف ویلور بغاوت کی محض نو گھنٹے میں ناکامی اور 300 سو سے زائد افراد کے بہیمانہ قتل کے بعد ٹیپو کے بچوں کو ٹالی گنج، کلکتہ بھیج دیا گیا اور زیادہ تر اہلِ خانہ میسور خاندانی قبرستان کالی گھاٹ کلکتہ میں مدفون کیے گئے۔ اس طرح گارڈن ریچ اور ٹالی گنج جو ضلع جنوبی چوبیس پرگنہ میں شامل تھے جنھیں آزادی کے بہت بعد ضلع کلکتہ کا حصہ قرار دیا گیا۔ یہ مواضع آزادی سے قبل علم وادب کا گہوارہ رہے ہیں۔ مشہور شاعر اعزاز افضل کا آبائی گھر ٹالی گنج میں ہی تھا۔

11 فروری 1856 برطانوی حکومت کے ذریعہ اودھ کے محاصرے اور معزولی کے بعد نواب واجد علی شاہ نے انگریزوں کی انصاف پسندی کی امید میں کلکتہ کا سفر کیا۔ 13 مارچ 1856 کو لکھنؤ کا تاجدار ادب وثقافت براہ الہ آباد تا بنارس بذریعہ پالکی اور پھر وہاں سے اسٹیمر کے ذریعہ 13 مئی 1856 کو ہگلی ندی کے کنارے مٹیا برج کلکتہ میں سکونت پذیر ہوا۔ نواب نے لارڈ ڈلہوزی سے انصاف نہ ملنے کے سبب اپنے نمائندوں کو ملکہ وکٹوریہ کے دربار سے انصاف کی امید میں لندن روانہ کیا۔ دریں اثنا 1857 کے غدر میں بیگم حضرت محل کی شمولیت کے سبب واجد علی شاہ کو 26 ماہ تک فورٹ ولیم میں نظر بند رکھا گیا تاہم ان کے ساتھ لکھنؤ کی ثقافت مٹیا برج اور اس کے نواح میں منتقل ہوگئی اور مٹیا برج اپنی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے باعث لکھنؤ ثانی قرار دیا گیا۔ ادبی اور ثقافتی سرخ روئی کے علاوہ مشرقی ہند میں کلکتہ جدید اور ترقی یافتہ برطانوی شہر کی ترجمانی کر رہا تھا۔ نئے نئے کل کارخانے کے قیام کی وجہ سے روزگار کے بے شمار دروازے کھل رہے تھے لہٰذا یوپی، بہار اور دلی کا متوسط طبقہ ہندوستان کی راجدھانی کلکتہ کی طرف نہ صرف پُر امید نظروں سے دیکھ رہا تھا بلکہ اُسے اپنی گوں ناگوں سرگرمیوں سے آراستہ کر رہا تھا۔

علامہ رضا علی وحشت کا خانوادہ 1857 میں انگریز سامراج کے خلاف پہلی منظم بغاوت کے نتیجے میں تاراج ہو کر بنگال کے ہگلی ضلع میں سکونت پذیر ہوا۔ اس وقت تک ہگلی میں نواب محسن علی خان اپنا شاندار کالج تعمیر کر چکے تھے۔ 1827 میں مرزا اسد اللہ خاں غالب نواب کی دعوت پر ہگلی کی سیر کر چکے تھے۔ بنگالی نژاد اردو شاعر علامہ رضا علی وحشت کے دادا غالب علی

خاں نے دہلی میں بھی طبابت کے پیشے کو اپنا وسیلۂ روزگار بنایا تھا۔ ہگلی میں آباد ہونے کے بعد بھی طبابت کو ہی فروغ دیا۔ وحشت نے بھی خودنوشت سوانح میں اس امر کا ذکر کیا ہے۔ بعد کے محققین نے غالب علی خاں کا شجرہ ذوالفقار علی خان سے منسوب کیا ہے جو اورنگ زیب کی حکومت میں 'عہدۂ ہفت ہزاری' سے سرفراز ہوئے تھے۔ پروفیسر فخرالدین اثر صدیقی نے اس سلسلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شہزادگانِ مغلیہ کے لیے مخصوص یہ عہدہ، اس شخص کو ملتا تھا جس کی وفاداری وجاں نثاری میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو لہٰذا اس عہدے کے حصول کے لیے ذوالفقار علی خاں کی ذاتی شخصیت اور خاندانی پس منظر ارباب اختیار کی نظر میں ضرور پسندیدہ رہا ہوگا۔

وحشت کا خاندان

غالب علی خاں کو پہلی جنگِ آزادی کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات اور انگریزوں کے مظالم نے بنگال کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ بنگال کی طرف مراجعت کرنے والے زیادہ تر خاندان ہگلی اور پنڈوا میں آباد ہوئے۔ حاجی محمد محسن ادب وثقافت کے حوالے سے ہگلی کو سرخیوں میں لا چکے تھے۔ انھوں نے یکم اگست 1836 میں نیو ہگلی کالج قائم کیا اور 1857 میں اس کا الحاق کلکتہ یونیورسیٹی سے ہوگیا۔ یہی کالج اب ہگلی محسن کالج کے نام سے بردوان یونیورسیٹی سے ملحق ہے۔ مرزا اسداللہ خاں غالب 1827 میں اپنے سفرِ کلکتہ کے دوران نواب کے مہمان رہے۔ وحشت کا خاندان اعلیٰ ظرف اور فیاض تھا۔ حکمت وطبابت انھیں ورثے میں ملی تھی۔ غالب علی خاں کے والد غلام علی اور دادا غلام حسن طبابت کے پیشے سے منسلک تھے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان کا خاندانی شجرہ ذوالفقار علی خاں سے ملتا تھا جو فوج میں جنرل تھے لیکن اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی کہ فوج سے طبابت کا سفر کب شروع ہوا۔ ''مشرقی بنگال میں اردو'' کے مصنف پروفیسر اقبال عظیم نے وحشت کے آبا واجداد کا تذکرہ اس وضاحت کے ساتھ کیا کہ انھیں یہ معلومات خود وحشت نے فراہم کیں۔ ملاحظہ ہو۔

> ''مولانا رضا علی وحشت کا سلسلۂ نسب خود انھیں کے بیان کے مطابق ان کے جدِ امجد ذوالفقار خاں سے ملتا ہے جو اورنگ زیب کے زمانے میں شاہی فوج کے ایک ممتاز جنرل تھے۔ مولانا وحشت نے اپنے

دادا کو کہتے سُنا کہ ناصری نے ایک مرتبہ ذوالفقار خاں کی مدحت میں یہ
شعر نظم کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

اے شانِ حیدری ز جبینِ تو آشکار　　نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

ہر چند معید رشیدی نے اپنی کتاب وحشت حیات اور فن میں اقبال عظیم سے اختلاف کرتے ہوئے ناصری کو ناصر علی سرہندی لکھا ہے اور شمس الرحمن فاروقی کی تائید بھی پیش کی ہے تاہم اس بات کی دلالت سبھی نے کی ہے کہ مذکورہ شعر نے ذوالفقار خاں کو بیخود کر دیا اور انھوں نے بطور انعام ایک خطیر رقم سے شاعر کو سرفراز کیا۔ اس نکتے سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا گھرانہ فارغ البال تھا بلکہ شعر و ادب کی قدر دانی ان کی وراثت کا حصہ رہی ہے لیکن یہی گھرانہ جب غدر سے تاراج ہوا تو وحشت کے دادا حکیم غالب علی خان نے دلی سے رختِ سفر باندھا اور بنگال کے مردم خیز ضلع ہگلی میں سکونت اختیار کی۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ایک بنگالی خاتون سے شادی سے کرلی جن کے بطن سے وحشت کے والد شمشاد علی خاں پیدا ہوئے۔ شمشاد علی کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔ عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم کے سہارے محکمۂ پولس میں انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت ملی لیکن طبیعت کی نری اور انگریزی حکومت کے عام ہندستانیوں پر جور و ظلم نے انھیں اس پیشے کو ترک کر کے بغرضِ ملازمت کلکتہ آنے پر مجبور کر دیا۔ کلکتے میں محکمۂ ڈاک میں ملازمت مل گئی اور بحیثیت پوسٹ ماسٹر مختلف ڈاک خانوں میں فائز کیے گئے۔ اب کلکتہ ان کی مستقل سکونت گاہ بن چکا تھا۔ مدرسہ عالیہ کے مدرس مولوی رحیم بخش کی دختر سے شمشاد علی کی شادی ہوئی۔ رحیم بخش بنگالی نژاد تھے۔ ان کی مادری زبان بنگلہ تھی۔ ڈاکٹر وفا راشدی نے اپنی کتاب ''حیات وحشت'' میں لکھا ہے کہ وحشت کی دادی اور والدہ دونوں کی زبان بنگلہ تھی لیکن اردو اچھی طرح بول لیتی تھیں۔ کلکتہ اور نواح میں آج بھی ایسے ذی علم افراد موجود ہیں جن کی مادری زبان بنگلہ ہے اور اردو و فارسی زبانوں پر یکساں دسترس کی وجہ سے ان کی تخلیقی اور تصنیفی کاوشیں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

ابتدائی زندگی

رضا علی وحشت کی پیدائش بروز جمعہ 18 نومبر 1881 میں 14 نمبر کڑا یہ روڈ، پارک سرکس کلکتہ میں ہوئی۔ وحشت نے اپنی مختصر خودنوشت میں اپنی جائے پیدائش کلکتہ ہی تحریر کی ہے

جس کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ رضا علی وحشت کی یہ خودنوشت 1973 میں شائع شدہ ادبی دنیا لاہور کے وحشت نمبر میں شامل ہے۔

اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں وحشت رقم طراز ہیں۔

''میں 18 نومبر 1881 میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد مولوی شمشاد علی ہوگلی کے رہنے والے تھے۔ والدہ باشندہ کلکتہ تھیں۔ دادا حکیم غالب متوطن دہلی تھے جنھوں نے ہوگلی میں سکونت اختیار کی میں نے مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی اور دوران تعلیم میں شعر وسخن سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور اساتذہ کا کلام کیا فارسی اور کیا اُردو برابر زیر مطالعہ رہا''

وحشت کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ جس طرح شرفا کے گھرانوں میں یہ چلن عام تھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کی رسم ادا کراتے، ابتدائی تعلیم میں اردو، فارسی اور عربی سے روشناس کراتے، گلستاں اور بوستاں کی حکیمانہ باتیں ذہن نشین کراتے۔ اس درمیان ذہن اس قابل ہوجاتا اور زبان پر گرفت اتنی مستحکم ہوجاتی کہ عقل وہوش کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ وحشت کو بھی تربیت کا یہی ماحول ملا۔ قرآن شریف اور ابتدائی دینی تعلیم کے حصول کے بعد جب ان کی عمر دس سال کی ہوئی تو انھیں مدرسہ عالیہ کے شعبۂ انگریزی میں داخل کیا گیا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی تاریخی درس گاہ ہے جسے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے 1780 میں مسلم شرفا کو عربی، فارسی اور اسلامی قوانین کی تعلیم دے کر عدلیہ اور انتظامیہ میں بحیثیت افسر تقرر کرنے کے لیے قائم کیا تھا تاہم ایک دہائی مکمل ہوتے ہوتے جدید علوم کے دیگر شعبے بشمول ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، فلکیات، اسلامی علوم، ایشیائی مطالعات، فلسفہ، ارضیات، قانون اور منطق وغیرہ شاملِ نصاب کر لیے گئے یہی نہیں بلکہ 1826 میں اینگلو عربیک ڈپارٹمنٹ کے ساتھ ساتھ ادویات کے پروفیسر ڈاکٹر بریشین کی سربراہی میں میڈیکل کی تعلیم بھی دی جانے لگی اور اناٹومی (عضویات) پر جان ٹیلر کی کتاب کا عربی میں ترجمہ بھی کیا گیا جس کا سلسلہ کلکتہ میڈیکل کالج (1836) کے قیام تک جاری رہا۔ المختصر مدرسہ عالیہ کو بیش بے بہا علمی خدمات اور جدید علوم وفنون کے مرکز کی حیثیت سے پورے مشرقی ہند میں امتیاز حاصل تھا۔ اس ادارے کے بام ودر غالب اور مرزا قتیل کی زبان دانی

کی مشہور زمانہ بحث کے گواہ ہیں۔ایک سے ایک جید علما اور ادبا اس ادارے نے پیدا کیے۔ وحشت کو یہ اعتبار حاصل ہوا کہ انھوں نے اس مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔

وحشت اپنے معلم مولوی خلیل احمد کی زیرِ سرپرستی زبان کی نازکی اور شاعری سے متعارف ہوئے لیکن جب شاعری شروع کی تو مولوی ابوالقاسم شمس کے شاگرد ہوئے جو داغ دہلوی کے شاگرد اور عبدالغفور نساخ کے خلفِ رشید تھے۔ناسخ،نساخ اور انسخ ایک ہی نوعیت کے فنکار گزرے ہیں جن کی ترجیح شاعری کی زبان اور زبان دانی رہی ہے۔عبدالغفور نساخ جوڈیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر بنگال، بہار، آسام کے مختلف اضلاع میں سفر کرتے رہے، فارسی اور بنگلہ تہذیب سے یکساں واقف تھے۔علاج کے سلسلے میں دہلی وارد ہوئے تو غالب نے نہ صرف ان کا کلام سُنا بلکہ عرصے بعد کسی کو اپنا کلام سُنایا۔ وحشت کی ذہنی تربیت میں یہ ماحول بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر انداز رہا۔ وحشت نے لکھا ہے کہ زمانۂ طالب علمی سے ہی انھیں مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور نظیری، عرفی، ظہوری، صائب، محتشم، ہلالی اور حزیں کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ اس ہمہ میر، غالب اور مومن کی شاعری کے مطالعہ نے ان کے شاعرانہ شعور کی بالیدگی میں نہ صرف مؤثر کردار ادا کیا بلکہ ان بڑے شعرا کے کلام سے ان کی اس رغبت نے بعد کے دنوں میں ان کے تخلیقی نگار خانے کو متور کر دیا۔

تعلیم اور کسبِ معاش

رضا علی وحشت 1890 میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بہرۂ انگریزی فارسی کے درجہ سوم میں داخل کیے گئے۔ 1898 میں کلکتہ یونیورسیٹی سے انٹرنس کے امتحان میں امتیازی نمبرات سے سند یاب ہوئے لیکن معاشی نا آسودگی حصولِ تعلیم جاری رکھنے میں مانع ہوئی۔ وحشت نے سلسلۂ معاش کے لیے تگ ودو شروع کی۔ 1901 میں حکومتِ ہند کے امپریل ریکارڈ شعبۂ فارسی میں مولوی اور چیف مولوی کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ یہ سلسلہ 1926 تک جاری رہا۔ انھیں بقول ڈاکٹر وفا راشدی 'قدیم شاہی فارسی دستاویزوں کے اندراجات' کی ذمہ داری سونپی گئی۔ان کی خدمت کی ستائش میں حکومت نے انھیں 1925 میں خان صاحب اور پھر 1931 میں خان بہادر کے خطابات سے نوازا۔ 1927 میں جب اسلامیہ کالج قائم ہوا تو اس کالج کے قیام میں

بنگال کے وزیر اعظم ابوالقاسم فضل الحق نے ذاتی دلچسپی لی لہٰذا اردو اور فارسی کی تدریس کے لیے نظرِ انتخاب آپ پر پڑی اور شعبۂ اردو و فارسی کے اولین پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ دس سال تک نہایت خوبی و نیک نامی کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے۔ ملحوظ رہے کہ یہ وہی مشہورِ زمانہ اسلامیہ کالج ہے جس نے بنگال کی تعلیمی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا اور ایک سے ایک نابغۂ روزگار پیدا کیے۔ آزادی کے بعد اس کا نام کلکتہ سنٹرل کالج اور اب مولانا آزاد کالج کلکتہ کے نام سے مشہور ہے۔ وحشت کے کمالِ علم و آگہی کا یہ حال تھا کہ سند تو ان کے پاس صرف انٹرنس تک کی تھی لیکن مطالعہ کا ذوق اور علومِ جدید کے حصول کی آرزومندی نے ان کی استعداد کو وہ جلا بخشی کہ ایک سے ایک نامور علم داں ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے جن کی ذہنی آبیاری میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ علامہ جمیل مظہری، پروفیسر عباس علی خاں بیخود، واقف بہاری، کیپٹن قمر صدیقی، ڈاکٹر وفا راشدی، پروفیسر شاہ مقبول احمد جیسی ایک سے ایک نادر شخصیات علامہ کی زیرِ سرپرستی آسمانِ شعر و ادب پر اپنا نقش چھوڑ گئیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، اردو اور فارسی کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی انھیں یکساں دسترس حاصل تھی۔ ان کے انگریزی مقالات کلکتہ کا تاریخی ادارہ مسلم انسٹی ٹیوٹ ریویو میں شائع ہوتے تھے۔ ان کی انگریزی دانی سے متعلق سید لطیف الرحمٰن نے نقوش لاہور کے شخصیات نمبر میں شامل اظہر قادری کے مضمون کے حوالے سے اپنی کتاب ''نساخ سے وحشت تک'' میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

> ''جس زمانے میں وحشت اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے، حیدرآباد کے یار جنگ بہادر تشریف لائے۔ ان کو انگریزی میں سپاس نامہ پیش کرنا تھا۔ انگریزی ادب کے ایک پروفیسر کے ذمے یہ کام سپرد کیا گیا۔ پروفیسر موصوف ایک انگریز پروفیسر مسٹر ہوم کے پاس گئے اور ان سے سپاس نامہ لکھنے کی درخواست کی۔ ہوم نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور مشورہ دیا کہ سپاس نامہ مولانا وحشت سے لکھوایا جائے تو بہتر ہے۔ پروفیسر موصوف کو پہلے تو یقین نہ آیا اور سوچا کہ مولانا وحشت کو انگریزی سے کیا واسطہ''

جب سپاس نامہ لکھ کر پروفیسر صاحب کو پیش کیا گیا تو وہ سخت متعجب ہوئے۔ انگریزی زبان پر ان کی دسترس اور کمال نے ان سے ایک کام اور لیا اور وہ یہ کہ وہ انگریز فوجی اور سول

افسروں کو اردو کی تعلیم بھی دیتے رہے ہیں اور انھوں نے انگریزوں کو زبان سے بہرہ ور کرنے کے لیے اردو انگریزی گرامر بھی لکھی۔

مولانا علم وادب کی ترویج واشاعت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ 1901 میں انھوں نے انجمن انیس الاسلام قائم کی جس کا مقصد نئی پود میں تحریر وتقریر کا ذوق پیدا کرنا تھا۔ اسی انجمن سے مولانا ابوالکلام آزاد بھی وابستہ رہے اور اس کے جلسوں میں برابر شرکت کرتے۔ اسلامیہ کالج میں درس وتدریس کے دوران انھوں نے طلبا میں ادب وشاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لیے 1933 میں سالانہ مشاعرے کی داغ بیل ڈالی۔ یہ مشاعرہ کلکتہ کا سب سے عظیم الشان مشاعرہ ثابت ہوا۔ ایک سے ایک قد آور شعرا اس مشاعرے میں شریک ہوتے۔ مشاعرہ طرحی ہوتا اور وحشت اس مشاعرے کی صدارت فرماتے۔ مشاعرے کا افتتاح اپنی کسی غزل سے کرتے اور بحیثیت صدر آخر میں طرحی غزل پیش کرتے۔ مولانا آزاد کالج میں وحشت کی قائم کردہ مشاعرے کی یہ روایت آج بھی یادگار وحشت کے طور پر قائم ودائم ہے۔ وحشت اسلامیہ کالج سے 1936 میں سبکدوش ہوئے۔ 1942 میں جب کلکتہ کے پارک سرکس میدان کے بالمقابل لیڈی برابورن کالج قائم ہوا تو وہاں اردو اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے اور 1947 تک اپنی خدمات انجام دیں

ازدواجی زندگی اور رہائش:

9 دسمبر 1906 مولوی محمد عباس کی دختر زبیدہ خاتون سے رضا علی وحشت کا عقد ہوا۔ مولوی عباس علی ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے اور کھلنا موجودہ بنگلہ دیش ان کا مسکن تھا۔ مولوی عباس لارڈ کرزن کے پرسنل سرجن ڈاکٹر ظہیر الدین کے داماد تھے۔ زبیدہ خاتون کے بطن سے متولد وحشت کی چودہ اولادوں میں تین بیٹے علی حسن، علی امام، علی اشرف اور پانچ بیٹیاں سلطانہ، رضیہ، شکیلہ، عائشہ اور جمیلہ کے سوا بقیہ اولادیں جانبر نہ ہوسکیں۔ لطیف الرحمٰن نے اپنی کتاب نساخ سے وحشت میں لکھا ہے کہ وحشت کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیوں میں ''علی حسن ڈپٹی کمشنر (اخیر میں حکومتِ پاکستان کے سکریٹری کے عہدے پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے)۔ علی امام (ڈھاکہ موجودہ بنگلہ دیش میں) انگریزی ادب کے پروفیسر اور علی اشرف کو موسیقی سے شغف تھا ایک صاحبزادی بھی پروفیسر ہیں'' وحشت صاحب کے بڑے بیٹے علی حیدر کو اعصاب کی بیماری

تھی۔ مولانا نے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ تین تین بار رانچی اسپتال لے گئے۔ خانقاہوں اور ولیوں کے آستانے تک رسائی حاصل کی لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ان سے متعلق ایک دل گیر واقعہ کا ذکر تقریباً سبھی تذکرہ نگارانِ وحشت نے کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب علی حیدر کا جنون حد سے بڑھ جاتا تو کیفیتِ جنون میں اسباب توڑ پھوڑ کرتا، جو سامنے آجاتا اُسے زدوکوب کرتا، کتابیں پھاڑتا غرض یہ کہ اُسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک عالم میں جب علی حیدر کو وحشت نے اپنے ہاتھوں سے بیڑیاں پہناتے ہوئے کہا کہ لو تمھاری یہی سزا ہے تو ہوش وخرد سے اس بیگانہ نے بے ساختہ وحشت صاحب کا یہ شعر پڑھا۔

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیرِ وفا ڈالی
تمھارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

ہوش کی باتیں سن کر وحشت زاروقطار رونے لگے۔ ان کے ساتھ گھر کے دیگر افراد بھی آہ وبکا کرنے لگے۔ بالآخر علی حیدر کی بیڑیاں کھول دی گئیں۔ بیٹے کے غم نے انھیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ آج تک اس کی تعبیر نہیں ہو سکی کہ جو دیوانہ اپنے کپڑے پھاڑ لیتا ہو، کتابوں کے اوراق بکھیر دیتا ہو اُسے اشعار برمحل کیسے یاد آجاتے ہیں۔ ایسی سینکڑوں مثالیں اہلِ ہوش وخرد کے پاس ہیں۔ اب اہلِ ہئیت وساخت اس نکتے کی کیا تفسیر پیش کریں گے

شعر چیزے دیگر یست

وحشت نے دو دہائی تک اپنے بیٹے کے علاج کے لیے دردر کی خاک چھانی اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ علی حیدر مفقودالخبر ہو گئے۔ جس کا تذکرہ وحشت نے اپنے ایک خط ارشد کاکوی مورخہ 6 اکتوبر 1952 میں قیاس کیا ہے کہ ''1946 عاشورۂ محرم کے دن وقوع میں آیا تھا، ہلاک ہوا'' (مکاتیبِ وحشت صفحہ 5)۔ وحشت کا شعر ہے۔

جدالِ فرقہ پرستاں سے خوف ہوتا ہے
زمینِ ہند کہیں رشکِ آسماں نہ بنے

24 ستمبر 1931 ان کی اہلیہ زبیدہ خاتون کا انتقال ہو گیا۔ اہلیہ کی وفات نے

وحشت کے دل پر کاری ضرب لگائی جس کا اظہار انھوں نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ میں نہایت سوز انگیز طریقے کیا ہے۔ یہ قطعہ اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام ''ترانۂ وحشت'' میں شامل ہے۔

آہ وہ میری رفیقِ زندگی — کر گئیں دنیا سے آخر انتقال
صدمۂ غم سے ہوا ہے سینہ شق — ہوگیا دل خستۂ حزن و ملال
نیک سیرت، نیک نیت، نیک دل — داخلِ فردوس ہو یہ خوش خصال
لکھ دیا وحشت دُرِ شہوارِ خلد — جب مجھے تاریخ کا آیا خیال

1350ھ

عقدِ ثانی

وحشت نے 1941 میں بقول وفا راشدی احباب کے اصرار پر ایک صاحب اولاد رشتہ دار بیوہ سے عقدِ ثانی کیا لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ مولانا 1910 تک جان نگر روڈ کلکتہ میں رہائش پذیر رہے۔ 1911 میں انھوں نے 2/1/2 دلکشا اسٹریٹ کلکتہ میں اپنا ذاتی مکان بنوایا۔ یہ مکان دو منزلہ اور کشادہ تھا۔ وحشت یہاں کم وبیش ربع صدی تک اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مقیم رہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بر بنائے مجبوری وہ مکان فروخت کر دیا اور 27 نمبر ویلسلی لین کلکتہ میں ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہوگئے جہاں 1935 تا 1950 نہایت عسرت زدہ زندگی بسر کی۔ اس مکان کی نچلی منزل پر ایک کمرہ تھا جو اکثر بند رہتا لیکن اتوار کے دن شام ہوتے ہی رونق آجاتی۔ ان کے شاگردان اور احباب جمع ہوتے اور وحشت حسبِ توفیق ان کی ضیافت فرماتے، شعر وسخن کا دور چلتا، حال واحوال سنے جاتے اور رات بھیگتے بھیگتے یہ محفل منتشر ہوجاتی۔

ڈھاکہ میں اقامت

تقسیمِ ہند نے برِّ صغیر کے جن لاتعداد خاندانوں کو تاراج کیا، ان میں وحشت بھی شامل تھے لہٰذا 1857 کا قصہ ایک بار پھر دُہرایا گیا اور رضا علی وحشت کا خاندان ایک بار پھر ہجرت نصیب ہوا۔ بقول رضا مظہری بچوں کے اصرار پر وہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی سمت کوچ کر گئے جہاں 1950 سے تا دمِ حیات 20۔ایل۔ تیسری منزل، عظیم پورہ کالونی

ڈھاکہ (موجودہ بنگلہ دیش) ان کی اقامت گاہ تھی۔ وہ اقامت گاہ بہت چھوٹی تھی اور مہمان خانے کا کوئی نظم نہیں تھا۔ مہمان آتے تو باہر کرسیاں ڈال دی جاتیں جبکہ کلکتے میں یہ عالم تھا کہ مہمانان اور شاگردان کی آمد پر پیکرِ اخلاص وحشت ان کی ضیافت میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ ڈھاکہ میں یہ مہمان خانہ سمٹ گیا اور پھر دھیرے دھیرے احباب کی آمد کا سلسلہ بھی کم ہو گیا۔

ذات وصفات

خان بہادر رضا علی وحشت گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے۔ پیکرِ اخلاص و مروّت، منکسر المزاجی، مشرقی قدروں کے دلدادہ، نیکی اور شرافت کی نشانیاں ان کی شخصیت کے خاص عناصر تھے۔ ڈھیلی ڈھالی لمبی شیروانی، شیروانی کی جیب میں نقرئی زنجیر سے بندھی گھڑی انھیں ہمیشہ وقت کا پابند رکھتی، چوڑی مہری کا پاجامہ، مخملی ٹوپی، ریشمی موزہ اور جوتا پہنتے۔ پاجامہ ٹخنوں سے اتنا اوپر ہوتا کہ موزے نظر آجاتے تاہم موزے بیحد قیمتی ہوا کرتے تھے۔ ان کی قد و قامت دلکش اور لائقِ توجہ تھی۔ مضبوط گٹھیلا جسم، دراز قد، صاف رنگ، کشادہ پیشانی، ذہانت سے معمور آنکھیں، گفتگو میں حلاوت، متانت میں شوخی و ظرافت، ڈاکٹر وفا راشدی جنھوں نے وحشت کو قریب سے دیکھا ہے، لکھتے ہیں کہ ''ان کے انکسار اور خوش خلقی کا یہ عالم تھا کہ پہلے پہل ملنے والے کو تصنع کا'' گمان ہوتا۔ ان کی شخصیت ہی ایسی متاثر کن اور دبنگ تھی جو ایک بار آپ سے فیض یاب ہوتا آپ کو بھلائے نہیں بھولتا اور ان کی ذات کی کشش کا گرفتار اور بے نظیر وضع داری کا گرویدہ ہو جاتا، چھوٹے بڑوں سے اس طرح پیش آتے کہ دوئی کا فرق مٹ جاتا، صرف لباس سے ہی نہیں بلکہ تہذیب و اطوار سے بھی ان کی حیثیت کلکتے میں مشرقی تہذیب و اخلاق کے سفیر کی تھی۔ وحشت کے عزیز شاگرد جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی رضا مظہری نے وحشت سے انسیت اور ان کے اخلاق و اطوار کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ رضا مظہری بھی مدرسہ عالیہ کے ہیڈ ماسٹر اور خوش فکر شاعر اور کلکتہ کی چند برگزیدہ علمی شخصیات میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون حضرت وحشت: چند یادیں اور کچھ تاثرات میں وحشت کی شخصیت پر کچھ یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔

> ''وحشت صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کا
> پاسِ وضع اور سلامت روی تھا۔ لباس ہمیشہ ان کا شیروانی، سفید پائجامہ

رہا۔ پہلے ترکی ٹوپی پہنتے تھے پھر ایرانی ٹوپی اور جب وہ بھی بازار میں کمیاب ہوگئی تو رام پوری پہننے لگے تھے۔ میں نے آج تک کبھی ان کو انگریزی لباس پہنتے نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں جب بہتوں نے انگریزی لباس ہی نہیں اختیار کیا بلکہ اپنی بڑھتی ہوئی داڑھی سے بھی مفارقت اختیار کرلی، انھوں نے اپنا لباس نہیں بدلا۔ حالانکہ وہ انگریز ان عالی تبار کی صحبتوں اور محفلوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا تھا۔ اکثر انگریز عہدہ داروں کو انھوں نے اردو پڑھائی تھی''

(یادگارِ وحشت، صفحہ 48)

مولانا نظم وضبط کے قائل تھے۔ اپنے روزانہ کا پروگرام ایک دن پہلے ترتیب دیتے اور اس پر سختی کے ساتھ عمل کرتے۔ صبح کے وقت پارک سرکس میدان میں چہل قدمی کے لیے نکل جاتے، وہاں سے واپسی پر اسٹیٹس مین اخبار خرید لاتے، اس کا مطالعہ کرتے اور پھر ناشتے سے فارغ ہوکر انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے نکل جاتے۔ اپنے سے کم عمر والوں کو بھی آپ کہہ کر مخاطب کرتے۔ کھانے میں چھری کانٹے کا استعمال کرتے۔ طعام کے وقت کوئی احباب موجود ہوتا تو خاندانی شرافت کا بھرپور مظاہرہ کرتے۔

پروفیسر اقبال عظیم لکھتے ہیں

مولانا کے گھر چلے جایئے صبح ہو یا شام، دوپہر ہو یا سہ پہر، آپ کی دستک کے ساتھ ہی مولانا دروازے پر ہوں گے۔ فوراً پردہ کرائیں گے اور آپ کو بڑی محبت سے اندر لیجائیں گے۔ بڑے صوفے پر آپ کو بٹھائیں گے اور خود ایک چھوٹی سی کرسی پر ایک گوشے میں بیٹھ جائیں گے۔ ابھی پانچ منٹ بھی گزرنے نہ پائیں گے کہ چائے اور عمدہ قسم کے بسکٹ، آپ کے سامنے ہوں گے۔ اس وقت آپ کا جی چاہے یا نہ چاہے۔ یہ تبرک اس انداز میں پیش کیا جائے گا کہ انکار کی جرأت ناممکن!

ذوقِ مطالعہ

وحشت کو علمی اور ادبی ماحول ملا۔ مطالعہ کا شوق تو انھیں بچپن سے ہی تھا۔ دورانِ مطالعہ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی ادب کے مشاہیر کی تخلیقات سے کسبِ فیض کیا۔ ان کے پاس علمی و ادبی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے رکن تھے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں مختلف علوم وفنون پر کتابیں موجود تھیں جن سے اکثر لوگ استفادہ کرتے تھے۔ جب دلکشا اسٹریٹ کے اپنے ذاتی مکان سے ویلسلی والے کرایہ کے مکان میں منتقل ہوئے تو اپنی کتابوں کا بڑا ذخیرہ دلکشا انسٹی ٹیوٹ کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر وفا راشدی رقم طراز ہیں۔

> ''وفات سے کچھ دن پہلے اپنی نادر و نایاب کتابیں ڈھاکہ یونیورسٹی کی نذر کر دیں۔ کلکتے سے ڈھاکہ ہجرت کرنے سے پہلے انھوں نے اپنی کتابوں کا بڑا حصہ کلکتہ یونیورسٹی لائبریری اور دلکشا لائبریری (انسٹی ٹیوٹ) کو دے دیا تھا۔ بچی بچائی کوئی ڈیڑھ سو کتابیں ان کے صاحبزادے علی حسن کے پاس محفوظ ہیں''

خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی

ہر چند وحشت کم گو واقع ہوئے ہیں لیکن احباب کی محفل میں اپنی خوش مزاجی اور شگوفہ گوئی سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ نئے ملاقاتیوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جو احباب بے تکلف تھے، وہ وحشت کی شگفتہ مزاجی کے گواہ اور ان کی خوش طبعی کے قائل نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے وحشت خان بہادر تھے۔ رعب و دبدبہ تو اس القاب کے ساتھ ہی شخصیت کا جزو ہو جاتا ہے لیکن وحشت کے مزاج کی نرمی اور حلیمی کے سبب احباب و شاگردان کے دلوں میں ان کی نرم شخصیت کا عکس ہی نظر آتا ہے۔ وحشت نے اپنی کم گوئی اور کم آمیزی کا ذکر اپنی ایک غزل میں کیا ہے۔

ہر شخص سے مانوس جو ہوتا نہیں وحشت
یہ ہے کہ کم آمیز ہے، مغرور نہیں ہے

نظم وضبط

جیسا کہ عرض کیا گیا، وحشت نظم وضبط کے قائل تھے۔ مشاعرے کی محفلوں میں ہمیشہ

وقت سے پہلے پہنچتے، شاگردان کے خطوط کا پابندی سے جواب دیتے۔ صبح سے شام تک کا پروگرام ایک دن پہلے ہی طے کر لیتے اور اس پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہوتے۔ ان کی پابندیِ وقت کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اک آدھ بار کی تاخیر کا تذکرہ پروفیسر عباس علی خاں بیخود کے حوالے سے ان کے بیشتر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وحشت ہوڑہ اسٹیشن پر 10 منٹ کی تاخیر سے پہنچے جبکہ تمام احباب جمع تھے۔ ہگلی کے ایک مشاعرے میں شرکت کی رضامندی حضرتِ وحشت نے دی تھی۔ ٹرین چھوٹنے ہی والی کہ وحشت ہانپتے کانپتے پہنچے اور اپنی تاخیر کی وجہ بتائی ''میرا چھوٹا لڑکا اشرف چھت سے نیچے گر گیا اور اُسے اسپتال پہنچا کر آ رہا ہوں''۔ پابندیِ وقت اور پاسِ وضع سے سرشار وحشت جیسی شخصیت کلکتہ میں دوبارہ پیدا نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی تو یوں بھی دیکھا گیا کہ جنابِ وحشت تنِ تنہا ڈائس پر موجود ہیں لیکن کیا مجال جو اپنی پابندیِ وقت کی خو چھوڑ دیں۔ مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہونے پر وقت سے نصف گھنٹے پیشتر تیار ہو جاتے۔ اگر پیرانہ سالی اور پاؤں میں تکلیف نہ ہوتی تو شاید سواری کا انتظار کیے بغیر پابندیِ وقت کا لحاظ کرتے ہوئے خود ہی رونق افروز ہو جاتے۔ ان کی اس خصوصیت کا اثر آنے والی نسل نے بھی قبول کیا۔

خیالِ خاطرِ احباب

اپنے عزیزوں اور شاگردوں کو بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے اور ان کی ترقی اور خوشحالی میں خود بھی خوش ہوتے اور دوسروں کو شریک بھی کرتے۔ ان کے حلقۂ احباب و عزیزان میں اگر کوئی معاشی مجبوری یا تنگدستی کا شکار ہوتا تو وحشت اس کی دستگیری کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔ پروفیسر فخر الدین اثر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''میرے بڑے بھائی حضرت قمر صدیقی کی ملازمت علالت کی بنا پر لا مائنیر کالج سے جاتی رہی تو پندرہ روپے ماہانہ سرکارِ وحشت سے وظیفہ ملنے لگا۔ دوسرے شاگردوں کی بھی اسی طرح اعانت کرتے اور صیغۂ راز میں رکھتے''۔

بنگال کے نامور شاعر علامہ جمیل مظہری کے برادرِ خورد رضا مظہری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ نے لکھا ہے کہ وحشت صرف اپنے شاگردان ہی نہیں بلکہ احباب اور عزیزان سبھوں کے

ساتھ یکساں سلوک روا رکھتے۔ رضا صاحب کی بیکاری کا ذکر جب جمیل مظہری نے مولانا وحشت سے کیا تو انھوں نے اپنے عزیز دوست نواب زادہ عبدالعلی کیپر آف امپریل ریکارڈ سے کہہ کر ان کے دفتر میں ''فارسی مترجم دستاویزات'' مقرر کرایا۔ مظہری نے مزید لکھا ہے کہ ان کی شادی میں وحشت کسی وجہ سے شرکت نہ کر سکے لہٰذا رضا مظہری جب کلکتہ آئے تو انھوں نے اپنی تمام تر پریشانیوں کے باوجود ان کی شان میں جلسہ منعقد کیا، ہار پہنایا اور سہرا بھی پڑھا۔ مشہور صحافی اور شاعر ابراہیم ہوش مدیر آبشار کلکتہ نے لکھا ہے کہ کلکتے میں نواب ڈلن کا مشاعرہ تھا۔ انھیں اپنی غزل کی اصلاح کے لیے وحشت صاحب سے بہتر اور کوئی نظر نہ آیا لہٰذا انھیں تلاش کرتے کرتے پارک سرکس میدان پہنچے اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ وحشت صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے انھیں جواب دیا'' آیئے ہری ہری دوب پر بیٹھ جاتے ہیں'' اور وہیں بیٹھے بیٹھے غزل کی اصلاح فرمادی۔ (بحوالہ مجلّہ سوغات مغربی بنگال اردو اکادمی)

علامہ تمنا عمادی نے'' وحشت مرحوم اور ان کی مہارت فن'' پر نہایت عرق ریزی سے ایک مضمون لکھا ہے۔ فنی گفتگو سے قبل انھوں نے مولانا کی وضع داری اور انکساری کا ذکر نہایت محبت سے کیا ہے۔ علامہ 1926 کے اواخر میں کلکتہ تشریف لاتے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت 21 سال تھی۔ وحشت ان سے عمر میں بڑے تھے لیکن قدر دانی میں کوئی کسر نہ رکھی۔ علامہ فرماتے ہیں۔

> ''باوجود اس کے کہ میری عمر 21 برس سے زیادہ نہیں تھی۔ مولانا مجھ سے عمر میں بڑے تھے مگر میرے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا میرے اعزاز میں ایک مشاعرہ کیا جس میں خاص احباب کو مدعو کیا اور ہر ایک سے میرا تعارف اچھے لفظوں میں کرایا۔ میں اس وقت علوم عربیہ درسیہ سے فارغ التحصیل تھا۔ شعر و سخن کا فطری ذوق تھا پھر اپنے والد ماجد فائز عمادی پھلواروی رحمتہ اللہ علیہ سے فنونِ ادب و شعر کی کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا اس لیے باوجود میری کم سنی کے مولانا وحشت اور ان کے احباب نے میری بڑی قدر افزائی فرمائی۔
>
> (یادگار وحشت، صفحہ 81)

حسنِ اخلاق

رضا علی وحشت مہمانوں کے خیر مقدم میں سراپا استقبال ہو جاتے۔ جب بھی کوئی برگزیدہ شخصیت کلکتہ وارد ہوتی، علامہ سے ضرور ہم کلامی کی سعادت حاصل کرتی اور مولانا ان کے اعزاز میں مشاعرے منعقد فرماتے۔ اردو زبان کی یہ ایک تہذیبی روایت رہی ہے۔ وحشت نے اس روایت کو سینے سے لگائے رکھا اور اسے فروغِ علم وفن کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ 28-1927 میں حضرت صفی لکھنوی کلکتہ تشریف لائے تو مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ایک مشاعرہ ان کے اعزاز میں منعقد کیا گیا۔ رضا مظہری فرماتے ہیں۔

> ''وحشت صاحب کو مجبوراً صدر بننا پڑا تھا اس لیے صفی سے پہلے نہ پڑھ سکتے تھے۔ صفی صاحب نے اپنا کلام سُنایا تو کافی سے زیادہ انھیں داد ملی۔ ان کے بعد حضرتِ وحشت نے اپنی غزل سنائی تو سامعین نے عموماً اور ان کے شاگردوں نے خصوصاً بہت زیادہ جوش سے داد دی۔ دوسرے دن انھوں نے کالج میں میرے بھیا (علامہ جمیل مظہری) اور ان کے ساتھیوں کو کلاس میں بلوا کر بیحد غصے میں ڈانٹا کہ آپ لوگوں نے صفی صاحب کے سامنے مجھے خفیف کیا اور کلکتہ کی مہمان نوازی کو بھی رسوا کیا۔ آپ لوگوں کو سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ میرے مہمان ہیں اور ہندوستان کے ایک برگزیدہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام سے زیادہ داد آپ کو میرے اشعار کی ہرگز نہیں دینی چاہیے تھی۔ وہ کیا سمجھے ہوں گے؟ شاگردوں نے دست بستہ معافی مانگی تب ان کا غصہ فرو ہوا''

تذکرہ نگاران لکھتے ہیں کہ وحشت کو اس ایک موقع کے سوا اور کسی نے کبھی غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ ان کی خوش مزاجی کا ہر کوئی معترف ہے۔ اپنی عمر سے کم لوگوں کی اسی طرح قدر کرتے۔ ان کے شاگرد قمر صدیقی کی جب فوج میں تعیناتی ہوئی اور جب وہ کلکتہ تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں بزم سجائی اور خود بھی غزل پیش کی جس میں ایک شعر تھا

قمر کے آنے سے محفل میں چار چاند لگے
سُخن قمر کے لیے ہے، قمر سخن کے لیے

وحشت میں خودداری اور خوداحساسی کی صفات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ معاشی تنگ دستی کے باوجود کبھی اپنی پریشانیوں میں کسی کی شراکت قبول نہیں کی۔ ان کی آمدنی محدود تھی اس کے باوجود مہمانوں کی خاطر داری اور احباب نوازی میں کبھی کوتاہ دستی نہیں دکھائی اور اپنی وضع پر قائم رہے۔ 1938 میں نواب رامپور نے دعوت دی تو خان بہادر کی خودداری نے ان کے حضور جانے سے روک دیا حالانکہ اس وقت وحشت سخت مالی مشکلات سے دو چار تھے۔ نواب صاحب نے دوبارہ دعوت دی لیکن وحشت نے ان کی دعوت قبول نہیں کی اور اپنی مشکلات سے خود باہر آنے کی کوشش کرتے رہے۔ وحشت دوسروں کے لیے دستِ شفقت بن جاتے لیکن اپنے لیے اپنی روش نہیں چھوڑتے۔ چونکہ وحشت نظم وضبط کے قائل تھے لہٰذا موقع بہ موقع احباب کی ہر فرمائش پوری کرنا ان کے لیے مشکل ہو جاتی اور خاطر داری بھی گراں گزرنے لگتی جو درج شعر سے ظاہر ہے جس سے ان کی شخصیت کی شفافیت عیاں ہو جاتی ہے۔

ہر اک موقع پہ پاسِ خاطرِ احباب مشکل ہے
مروت نے دیا ہے مفت کا یہ دردِ سر ہم کو

طبعِ رواں

مولانا کی ذہانت کا یہ عالم کہ بات سے بات پیدا کرتے، شعروں میں محاورہ کا لحاظ، خیال کی نازکی اور خوش ادائی، پُرکشش اور فارسی تراکیب سے آراستہ پرشکوہ زبان بنگال میں اور کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ پیروی غالب کی تو اس کا حق ادا کر دیا، نثر لکھی تو زبان کی چستی اور برجستگی کی اہلِ زبان سے داد وصول کی۔ غالب کا اتباع ہر طرح سے کیا، خطوط بھی لکھے تو یادگار، فارسی میں غزلیں بھی کہیں تو بے شمار، مختلف مواقع اور مختلف شخصیات پر قصائد بھی ختم المرسلین کی شان میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنی عقیدت اور مشاقی کے پھول کھلا دیے۔ داخلی اور باطنی دونوں ہی سطح پر متمول نہ کبھی کسی کے سامنے کسی کو ہیچ کیا نہ خود کسی نے ایسی جرأت کی۔ اپنی ذات میں انجمن لیکن آخر وقت میں اہلِ انجمن کی شکایت لبوں تک آ ہی گئی

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

شاعری کی ابتدا

رضا علی وحشت کو جو علمی اور ادبی ماحول ملا، اس میں ان کی تخلیقی جبلت کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ زبان کے رموز سے واقفیت اور مطالعہ کی کثرت نے ان کے اندر کی چنگاری کو شعلہ فگن کر دیا۔ شاعری کے لیے زبان سے آگہی بنیادی شرط ہے۔ وحشت اردو، عربی اور فارسی کی سہ لسانی تشکیل کی پیداوار ہیں جس میں غلبہ فارسی زبان وادب کی تہذیبی ثقافت کا ہے۔ ان کا علمی و ادبی سفر فارسی زبان کے عروج کی گواہیوں سے شروع ہوتا ہے۔ اردو شاعری اور نثر انگڑائیاں لے رہی تھیں اور قدیم طرزِ سخن کے دل دادہ فارسی اور عربی کی روایت کو گلے لگائے بیٹھے تھے۔ فارسی زبان پر دسترس شرفا کے لیے اعزاز اور شعرا اور ادبا کے لیے تخلیقی اعجاز حاصل کرنے کا نہ صرف قابلِ قبول وسیلہ تھا بلکہ مشرق کی تہذیبی روایات سے آگہی حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ انگریزوں کی ہندوستان پر دو سو سالہ حکومت کے باوجود اس زبان نے ہندستانی ادب پیدا کرنے میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ اس زبان کا ثقافتی رشتہ یہاں کی تہذیب سے استوار نہیں ہوا تھا۔ اس کی جڑیں یہاں کی مٹی میں پیوست نہیں ہوئی تھیں۔ شرفا انگریزوں کی محفلوں میں رسائی کے لیے زبان کی حد تک اسے ضرور سیکھتے تاہم جدید علوم وفنون کی ترسیل کے لیے یہ زبان تیزی سے اپنی جگہ بنا رہی تھی یعنی ایک سمت سورج غروب ہو رہا تھا تو دوسری سمت ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، وحشت اسی دور کی پیداوار ہیں۔ انگریز مشرقی اقدار کی بے قدری کے سو سو جتن کر رہے تھے، مدرسوں اور پاٹھ شالوں کی جگہ اسکول لینے لگے۔ مہاراجاؤں اور نوابوں کی طرز کا لباس ہوٹل کے بیروں کو پہنایا جانے لگا۔ پڑھو فارسی اور بیچو تیل کی صدا سنائی دینے لگی۔ انگریزی زبان اور لباس متوسط ہی کیا بلکہ اعلیٰ گھرانوں کی پسند ہوتی جا رہی تھی کہ جو نظامِ حکومت اور عدلیہ رائج تھی اس میں اپنی جگہ بنانے کے لیے علمی گھرانے انگریزی تہذیب کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی سرگرمیاں تیز ہو چکی تھیں۔ انگریز اپنی حکومت کے دفاع کے لیے اس متحدہ قومیت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے مختلف حکمت عملی اپنا رہی تھے۔ غالب کے عہد میں جس تہذیبی کشمکش کی ابتدا ہوئی تھی، اس کا سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ وحشت نے یہ سب تبدیلیاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور انھیں محسوس

بھی کیا۔ غالب کے یہاں جن تہذیبی اقدار پر اعتماد اور مضبوطی قائم تھی، وہ اعتماد اب متزلزل ہو رہا تھا۔ اس صورت حال کی نشانیاں وحشت کی شخصیت اور شاعری میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

جگر لاؤں کہاں سے میں جو تاراجِ چمن دیکھوں
انھیں آنکھوں سے کل رنگینیاں دیکھی ہیں گلشن کی

وحشت نے غزل گوئی کی ابتدا 1896 سے کی۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ عام طور سے اردو شعرا اسی عمر میں شعر کہنے کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس عہد میں شعر گوئی علم داں کے لیے وجہِ افتخار ثابت ہوتی تھی اور نیا ذہن آسانی سے اس سمت راغب ہو جاتا تھا۔ دوسری بات زبان پر گرفت اتنی مضبوط ہو جاتی کہ وہ اہلِ فن کے کلام سے نہ صرف حظ اٹھا سکتے بلکہ اس نہج پر خود بھی شعر گوئی کر سکتے تھے۔ تیسری بات فن کارانہ اظہار کے لیے اس سے موثر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ رقص اور موسیقی کو ضرور اعتبار حاصل تھا لیکن اس کی قدر دانی مخصوص گھرانوں میں محصور تھی۔ شعر و سخن سے ہم رشتہ محفلیں عوام و خواص میں بے حد مقبول تھیں کہ زبان اور تہذیب کی اعلیٰ اقدار کی ثنا خوانی کا سب سے بہتر وسیلہ شاعری ہے۔ رضا علی وحشت نے جب شاعری شروع کی اس وقت داغ اور امیر کی شہرت چاروں دانگ پھیل چکی تھی۔ خود وحشت کے استاد ابوالقاسم شمس داغ دہلوی کے شاگرد تھے لیکن وحشت نے اتباعِ غالب کو شعار بنایا۔ وحشت کے نزدیک شاعری میں اتباع ایک تہذیبی روایت ہے اور شعرا سلسلۂ تہذیب کی وہ کڑیاں ہیں جو پوری تہذیب کو جوڑے رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم انفرادی فطانت اور تخلیقی جوہر پاروں کی شناخت کے لیے شعرا کے کلام کو بطور اکائی پیش کرتے ہیں اور ان کی انفرادیت کے تعین کو تنقید کا جزو اعظم سمجھتے ہیں لیکن جب تہذیبی شناخت کی بات آتی ہے تو ایک ایک نکتے کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے جس کی رنگ آمیزی کے بغیر تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ غالب کی انفرادیت کا ذکر ہو اور اُس شعری ماحول کا ذکر نہ ہو جس میں ابراہیم ذوق بھی تھے، مومن خاں مومن بھی تھے۔ ذوق نے شاعری نہ کی ہوتی تو غالب کی انفرادیت کا رنگ اُبھر کر سامنے نہیں آتا۔ وہ تخلیقی کشمکش، وہ معاصرانہ چشمک جو فن کار کو اپنی انفرادیت حاصل کرنے میں مہمیز کرتی ہے، کہاں میسر ہوتی۔ جہاں غالب نے اپنے پیش رو کی تحسین کی، وہیں ہم عصروں کی قدر دانی میں پیچھے نہیں رہے اور

معاصرانہ چشمک پر اتر آئے تو غالب سے جس طرح کے شعر کہلوائے، وہ کہاں ملتے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہم مانیں یا نہ مانیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انفرادی فطانت موافق ماحول کے بغیر اپنی حشر سامانیاں پیش نہیں کر سکتی۔ غالب کو غالب بنانے میں دہلی کی زبان، فارسی کی روایت، شاعرانہ ماحول، غالب کا عہد اور ثقافتی سرپرستی کے رول سے انکار نہیں کیا جا سکتا جس نے غالب کی غزل کو دو آتشہ بنا دیا ہاں یہ ضرور ہے اس مقام پر پہنچنے کے لیے جس تخلیقی قوت اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ غالب میں بدرجۂ اتم موجود تھی اور کیوں نہ ہو کہ شعر گوئی کے ذریعہ عمومی فہم و فراست کے لوگ اپنا مقام بنانے میں قاصر رہتے ہیں۔

وحشت بنگال کی ایک بڑی علمی شخصیت تھی۔ انھیں کئی اعتبار سے فضیلت حاصل تھی۔ ایک بلند پایہ شفیق استاد کی حیثیت سے ان کا نام معروف زمانہ تھا۔ اردو و فارسی ادبیات پر گہری نظر تھی۔ میر، سودا، غالب، مومن اور آتش کے کلام کے مطالعہ نے انھیں اپنی سمت متعین کرنے میں معاونت کی۔ اس انتخاب میں اسلوبِ غالب کو اپنا شعار بنا لیا اور بنگال میں وحشت غالب کی آبرو بن کر نمودار ہوئے۔ انھوں نے کلامِ غالب سے کسبِ فیض کیا۔ اس کے ساتھ دیگر شعرا ءِ نکتہ داں کی قدر ان کے دل میں ضرور تھی۔ وحشت کو اپنی "طبعِ خداداد" پر یقین تھا، اس کے باوجود ریاضت کم نہیں کی۔ وحشت کا دعویٰ ہے کہ غالب نے نظیری سے کسبِ فیض کیا اور وحشت نے غالب سے۔ ملاحظہ ہو۔

سخن آموز، غالب از نظیری وحشت از غالب
چراغے را کہ دودے ہست از سر زود درگردد

فروغِ طبعِ خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لیے

جیسا کہ عرض کیا گیا وحشت نے صرف غالب ہی نہیں بلکہ اردو کے بڑے شعرا سے

عقیدت مندی کا برملا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کلامِ میر پڑھ پڑھ کر ہوا ہوں نکتہ ور وحشت
تلمذ ہے اسی استاد کا طبعِ سخنداں سے

یاد ہے وحشت تجھے آتش کی وہ پیاری غزل
تار تار پیرہن میں بس رہی ہے بوئے دوست

میں تو ہوں معتقدِ داغ غزل میں وحشت
جس کی ہر بات ہم آہنگِ اثر ہوتی ہے

تصنیف وتالیفات

وحشت کا پہلا دیوان بعنوان دیوانِ وحشت 1910 میں ستارہ ہند پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس وقت وحشت کی عمر بمشکل اٹھائیس، انتیس سال تھی لیکن اس دیوان نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی۔ علامہ شبلی، الطاف حسین حالی، ڈاکٹر محمد اقبال، ظہیر دہلوی یادگار زوق، شوق قدوائی نیز مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلّٰی میں، مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار میں، عبدالحلیم شرر لکھنوی نے رسالہ دل گداز لکھنؤ، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی نے ادیب الہ آباد اور میرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے رسالہ معیار لکھنؤ میں اس دیوان کی خوب ستائش کی۔ انھوں نے اپنے اُستاد شمس کلکتوی کا دیوان مع مقدمہ تالیف کیا اور 1920 میں ستارۂ ہند پریس کلکتہ سے شائع کیا۔ وحشت کا دوسرا دیوان ترانۂ وحشت کی اشاعت 1953 میں مکتبۂ جدید لاہور نے کی۔ ترانہ وحشت کا دوسرا ایڈیشن سال 1969 کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں دیوانِ اول کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ نئی غزلیں ترتیب میں آگے رکھی گئیں اور دیوانِ اول کو ضمیمہ کی طرح شائع کیا ہے۔ وحشت نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک کتاب نقوش وافکار مکتبہ عارفین قرآن منزل ڈھاکہ نے 1957 میں شائع کی۔ وحشت کے مضامین کا مجموعہ ''مضامینِ وحشت'' مرتبہ جمال احمد صدیقی زیر اہتمام مغربی بنگال اردو اکادمی ان کے صد سالہ جشنِ پیدائش

کے موقع پر 1982 میں اشاعت پذیر ہوا۔

کلکتہ سے ہجرت

تقسیم ہند کے بعد وحشت اندر سے بالکل ٹوٹ گئے۔ کلکتہ کا ماحول بیحد تکلیف دہ ہو چکا تھا۔ تقسیم ہند کی سگبگاہٹ اور غیر یقینی سرحد کے اعلان کی وجہ سے کلکتہ میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا جس کا سلسلہ 1946 سے ہی شروع ہو گیا تھا اور 1950 تک قتل وغارگری کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وقفے وقفے سے آگ وخون کے شعلے لپکتے اور بستیاں ناپید ہو جاتیں۔ کلکتہ اور نواح خاک وخون میں ڈوب گئے۔ اس صورت حال نے بہتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وحشت کا منجھلا بیٹا علی حسن ایس ڈی او کی حیثیت سے میر پور میں تعینات تھا۔ اس وقت سرحد کے دونوں ہی جانب کے افسران یا تو ڈھاکہ یا کراچی بھیج دیے گئے یا پھر وہاں سے کلکتہ چلے آئے۔ بیشتر افسران نے اس تبادلے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔ اپنے بچوں کے پیہم اصرار کی وجہ سے وحشت بھی ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ مشرقی پاکستان جانے کے بعد شخصیت میں وہ جاہ وجلال باقی نہ رہا۔ اندر اندر محزونی طبیعت حاوی ہوتی گئی۔ اپنے ایک مکتوب بنام ظفر ہاشمی میں وہ اپنے درد کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آپ کا وحشت زندہ ہے۔ میں زندہ ہوں لیکن زندگی کے
جو معنی ہیں اس کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا۔ ضعفِ پیری مستقل ہے۔ میر پور
میں اپنے لڑکے علی حسن سلمہٗ کے ساتھ ہوں جو یہاں ایس ڈی او ہے۔
باقی کنبہ ڈھاکہ میں ہے۔ یہاں میری صحت اچھی نہیں ہے''

(مکاتیب وحشت صفحہ 111)

مسلسل گرتی ہوئی صحت، احباب سے دوری اور بار بار کلکتہ کی رونقوں، مجالس اور بے تکلف ادبی ماحول جہاں انھوں نے زندگی کی ستر بہاریں دیکھیں، انھیں رنجیدہ طبیعت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ کلکتہ کی فراغت وحشت کو ڈھاکہ میں کہاں نصیب تھی۔ ان سب باتوں نے ان کے طبع نازک پر کاری ضرب لگائی اور وہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

زمینِ ڈھاکہ نے کی قلب پر افسردگی طاری
ہوا خلوت نشیں میں اور شوقِ انجمن چھوٹا

وطن اور وہ بھی کلکتہ، غضب تھا چھوٹنا اس کا
قیامت ہوگئی وحشت سے وحشت کا وطن چھوٹا

رنجیدہ خاطر وحشت ڈھاکہ جانے کے بعد بھی فکر وعمل سے غافل نہیں ہوئے۔ وہاں کی تقریبات میں شرکت کرتے، خصوصی طور پر یومِ اقبال کی دو تقریبات منعقدہ 1951 اور 1952 میں نہ صرف شرکت کی بلکہ وہاں بھی وہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ مشاعروں، ادبی مجالس و مذاکرات میں برابر شرکت کرتے لیکن ضعف اور پرانے احباب کی مفارقت نے انھیں پُر جوش شرکت سے معذور کر دیا۔ پنشن کی وصولی کے لیے کلکتہ آتے تو کھل اٹھتے۔ کلکتہ آنے سے قبل اپنے بھتیجے ابوالخیر فاروق کو تفصیلی خط اور آنے کا پروگرام بتا دیتے۔ آخری ایام میں ضعف اتنا بڑھا کہ لکھنے پڑھنے سے بھی معذور ہو گئے۔ ذیابیطس کا مرض دھیرے دھیرے قویٰ کو کمزور تر کرتا رہا۔ اسی عالم میں احباب کے خطوط کا جواب بھی دیتے۔ کلکتہ سے جدائی وحشت کے لیے ایک مسلسل عذاب تھا۔ یہاں کی محفلیں، رونقیں اور حلقۂ احباب انھیں بہت یاد آتے جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے خطوط میں بار بار کیا ہے۔ اپنے شاگردِ رشید پروفیسر عباس علی خاں بیخود کو انھوں نے لکھا۔

"ملنے والے یہاں متعدد ہیں لیکن وہ خلوص جو کلکتے کے محبانِ عزیز میں مجھے ملتا تھا، اس کا یہاں فقدان ہے۔ تکلف کی ملاقاتیں دل کو راحت نہیں پہنچاتیں۔ کلکتہ کی بات کلکتہ کے ساتھ گئی"

(مکاتیب وحشت صفحہ 12)

پروفیسر بیخود کے نام ایک خط میں رسمی ملاقاتیوں سے بیزاری کا اظہار کچھ یوں فرماتے ہیں۔

"رمضان کا مبارک مہینہ ہے۔ اس میں مشاعرے نہیں ہوتے۔ مجھے آرام ملتا ہے۔ اس مہینے میں کم لوگ دوست احباب سے ملنے کو نکلتے ہیں اور یہ بھی میرے لیے راحت کا سبب ہے کیونکہ ان رسمی ملاقاتوں میں مجھے مزہ نہیں آتا جن سے ملنا مجھے مسرت کا باعث ہوتا ہے انھیں تو میں کلکتہ چھوڑ آیا ہوں

(مکاتیب وحشت، صفحہ 26)

وفات

خان بہادر رضا علی وحشت المعروف بہ وحشت کلکتوی 20 جولائی 1956 اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ جولائی کے مہینے میں بنگال میں ویسے ہی مینہ خوب برستا ہے۔ ان کی وفات کے دن بھی وہی عالم تھا۔ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا عظیم پورہ قبرستان ڈھاکہ جہاں وہ دفن کیے گئے، اُس کا تہائی حصہ برسات کے دنوں میں زیرِ آب ہو جاتا تھا۔ اُس دن بھی وہی ہوا۔ موسلا دھار بارش سے قبر زیرِ آب ہوگئی۔ جسمِ خاکی کو کیلے کے تنے پر رکھا گیا اور اس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور سارا جسم پانی میں ڈوب گیا۔ کیا رقت آمیز منظر ہوگا۔ غالب کا اتباع کرنے والا وقتی طور پر ہی سہی غالب کے شعر کی تعبیر بن گیا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

خیر وحشت کا جنازہ بھی اُٹھا اور عظیم پورہ قبرستان میں ان کی قبر بھی ہے تاہم پتہ نہیں چراغ جلانے والے وہاں موجود بھی ہیں یا نہیں۔ تقسیم نے نہ صرف ہم سے ہمارا شاعر چھین لیا بلکہ اُسے یاد رکھنے کے اسباب اور اس کی نشانیاں بھی چھین لیں۔ کلکتہ میں ان کی رحلت کی خبر کئی روز بعد پہنچی۔ ایک کہرام مچ گیا۔ بزمِ احباب نے اپنے سابق صدر کے لیے جلسۂ تعزیت منعقد کیا۔ علامہ جمیل مظہری نے اپنے استاد کی یاد میں ایک دل پذیر نظم ''شمعِ شبستانِ سخن'' لکھی۔

ہم پہ اک سایۂ دامانِ پدر تھے وحشت
جس پہ آنچ آئے کوئی سینہ سپر تھے وحشت
خستگی جس کو بلائے وہ شجر تھے وحشت
بس کہ اک نخل سرِ راہ گذر تھے وحشت
جس میں راحت تجھے اے بے وطنی ملتی تھی
ہر مسافر کو جہاں چھاؤں گھنی ملتی تھی

ادبی اور تخلیقی سفر

واقعہ ہے کہ شاعر کو اگر صرف شعر کے لفظی حصار میں قید کر دیا جائے تو وہاں صرف جگمگاتے ہوئے لباس کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا جس سے نہ شخصیت کی پہچان ممکن ہے اور نہ ہی اس کے فن کی۔ شاعر کی زندگی شعر کے لفظی معنوں سے نہیں بلکہ ان کی کیفیات سے مماثل ہے جن سے آشنائی اس کے ذہن کے بند دریچوں کو دھیرے دھیرے کھولتی ہے اور اس کی فطری صلاحتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ کس شے کو کن نظروں سے دیکھتا ہے اور اسے کیا کیف ملتا ہے، کیسے محسوس کرتا ہے اور کس طرح بیان کرتا ہے۔ تنقید نگار کا مقصد ان ہی چیزوں کی نقاب کشائی سے عبارت ہے۔ ہم اس وقت تک تخلیق کو تنقید کے شانہ بشانہ نہیں کھڑا کر سکتے جب تک ہم خود تخلیقی عمل کی کیفیات کے روبرو نہ ہو جائیں۔ دوسری بات ادبی اور ثقافتی ماحول ایک تخلیق کار کی ذہنی اور تہذیبی تربیت کے لیے از حد ضروری ہے۔ ثقافتی سرپرستی کے بغیر کسی بھی زمانے کا ادب معاشرے میں زندہ نہیں رہ سکتا، کتب خانوں کی زینت ضرور بن جاتا ہے۔ ثقافتی سرپرستی سے میری مراد معاشرہ تخلیقی فن کار کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور ان سرگرمیوں کے فروغ کے لیے اپنی شرکت درج کراتا ہے۔ وحشت کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں یہ ماحول میسر تھا۔

وحشت کی شاعری یا کسی کی بھی شاعری کو پرکھنے کے لیے ان مدارج سے گزرے بغیر تخلیق

سے انصاف ممکن نہیں۔ جس طرح کی تنقید سے وحشت کی شاعری گزری ہے، ان میں سے بعض تو بے حد سطحی ہیں اور بعض نے حق تنقید ادا کرنے کی پوری سعی کی۔ وحشت کی شاعری میں تقلیدِ محض کا عکس دیکھنے والے دراصل وحشت شناسی کے فیض سے محروم ہیں۔ ان کا زاویۂ نگاہ وحشت کی شاعری کے مختلف گوشوں تک پہنچنے سے قاصر رہا۔ نظیر احمد صدیقی کے مقالے کا خلاصہ دیکھیے جس سے کسی حد تک آپ تعین کر سکتے ہیں کہ وہ انسان کے زاویۂ نگاہ یا وحشت کی نگاہ سے کس قدر واقف ہیں۔

> ''مولانا نے اردو شاعری کو کچھ نہیں دیا۔ وہ پیرو غالب ہونے کے باوجود پیروی کا حق ادا نہیں کر سکے اور یہ کہ ان کی شاعری دماغ اور کاوش کی پیداوار ہے، دل اور جذبات کی نہیں جسے حقیقت نگاری سے کوئی تعلق ہے نہ زندگی سے نہ داخلیت سے نہ جذباتیت سے''

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مضمون نگار کا دماغ وسعت کی دنیا چھوڑ کر ایک ایسے خول میں مقید ہے جہاں صرف یہ آواز گونج رہی ہے کہ وحشت ناکام رہے یا صرف یہ سوچ کر لکھنا شروع کیا کہ ثابت کرنا ہے کہ وحشت نے اتباعِ غالب کا حق پورا پورا ادا نہیں کیا۔

ان خیالات سے ہٹ کر اگر ہم انصاف سے وحشت کی شاعری اور ان کی حیات و خدمات کا جائزہ لیں تو شاید کچھ نئے پہلو سامنے آئیں کیونکہ قوتِ فیصلہ ان گوشوں کے بارے میں بھی انکشاف کرتی ہے جو تخلیق سے تعلق رکھتی ہیں اور نہیں بھی۔

وحشت (1881-1956) کی انفرادیت ان کے ہم عصروں میں صرف یہی نہیں کہ انھوں نے غالب کی تقلید کی اور ان اسالیب زبان و بیان کو اپنی شاعری میں جگہ دی جو غالب کا خاصہ تھے بلکہ اس طرح انھوں نے غالب سے اپنی پوری وابستگی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس کی وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وحشت نے غالب کی شاعری سے ایک ایسا تاثر لیا اور اندازِ بیان کے احاطے میں لفظ اور معنی کا وہ رشتہ تلاش کیا، فکر کی وہ بلندیاں دیکھیں جو غالب کے معاصر شعرا کے یہاں خال خال ملتی ہیں۔ غالب کی شاعری میں بعض تراکیب اور اچھوتے افکار ذہن میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو عموماً دوسرے بڑے شعرا کے یہاں نہیں ملتے۔ اگر وحشت کی شاعری پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر غالب کی تقلید کی تو یہ امر قابلِ نفی نہیں۔ اس کا تذکرہ خود

وحشت نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

وحشت ہمیں تتبع غالب ہے آرزو
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

سخن آموخت غالب از نظیری وحشت از غالب
چراغے را کہ دووے ہست در سرزود در گیرد

تیرے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت
کہ مقدر ہے ترا غالبِ دوراں ہونا

جہاں تک تقلید کا سوال پیدا ہوتا ہے، شاعری میں اس کی بیشتر مثالیں ملتی ہیں۔ تمام جذباتی وتصوراتی لوازمات تمام بڑے شعرا کے یہاں مشترک ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی فرق ہے تو بس رویّے کا۔ ہر دوسرا انسان ایک ہی شے کو مختلف زاویے سے دیکھتا ہے، یہ فطرت انسانی ہے۔ وحشت تصوراتی مراحل سے گزرتے ہوئے جذبات کی سطح پر آ کر چونکا دیتے ہیں اور یہ کیفیت اسی وقت واقع ہوتی ہے جب انسان اسی شے کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ سطحی پیروی یا وابستگی نام تو پیدا کروا سکتی ہے لیکن کیفیات سے محروم کر دیتی ہے۔ وحشت کی اولین ایامِ شاعری میں داغ کے رنگ کے ایک آدھ اشعار ضرور مل جاتے ہیں لیکن بقول عباس علی خاں بیخود ''وحشت نے میر و غالب کی وسیع دنیا میں پناہ لی اور اپنی ایک الگ دنیا قائم کر لی''

وحشت کے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

حسن آفریں ہوا ہے تصور جمال کا
دل کو ہوائے گل نے گلستاں بنا دیا

میں سبک سر بن کے کیوں گرتا نہ قدموں پر ترے
مجھ کو کیا معلوم ہے تو سرگراں ہو جائے گا

دل گو رہا ہے وقفِ ستم ہائے روزگار
روشن ہے داغِ عشق سے یہ انجمن ہنوز

ضبط کی ہوتی ہے اک حد ضبط کرتے تا بکے
ہم بھی عاجز ہو کے مصروفِ فغاں ہونے لگے

امید کیا رکھوں کسی بیگانہ خو سے میں
اب رفتہ رفتہ دل ہی کو یاس آشنا کروں

اور غالب کے یہ اشعار دیکھیں:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

وحشت کے یہاں اس طرح کے اشعار وافر تعداد میں ملتے ہیں جن سے صرف یہی گمان نہیں ہوتا کہ وحشت کا اندازِ بیان اس حد تک غالب کے قریب ہے بلکہ دھوکہ ہونے لگتا ہے کہ غالب کے دیوان میں یہ اشعار شامل ہونے سے رہ گئے تاہم یہ سلسلہ زیادہ دن تک چلا نہیں۔ وحشت پیرایۂ غالب میں اپنی دنیا تلاش کرنے میں بدستور کوشاں رہے لیکن جہاں تک دیوانِ اول کی بات ہے، وحشت کی ویسی ہی شبیہ بنی جیسا وحشت چاہتے تھے۔

دیوانِ اول اور معاصرین کی آرا

وحشت اس عہد کی پیداوار ہیں جب داغ، امیر اور حسرت وغیرہ کی شاعری اپنے عروج پر تھی۔ داغ و امیر کی شاعرانہ روش ان کے معاصرین اپنائے ہوئے تھے یہاں تک کہ ابوالقاسم شمس (وحشت کے استاد) بھی اس سے مستثنیٰ نہیں لیکن وحشت کی مروجہ زمانہ شاعری سے بغاوت اور غالب کے اندازِ بیان سے قربت یہ ثابت کرتی ہے کہ انھوں نے غالب کا اتباع ہی نہیں کیا بلکہ ان کے اسالیب اور زبان و بیان کو عام کرنے کی سعی بھی کی بقول حالی۔

''مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے یہ حق ہم سے چھین لیا ہے۔''

وحشت کی شاعری کا مطالعہ ہمیں ان دو ادوار سے آشنا کرتا ہے جن کے درمیان وحشت کا ذہن ارتقا کے مراحل سے گزرا۔ ان کا پہلا دور ان کی شاعری کا اولین دور ہے جب عموماً شاعری تقلیدی یا رسمی ہوتی ہے اور دوسرے دور کی شاعری اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب وحشت کی زندگی داخلی و خارجی حادثات سے کسی حد تک مسخ ہو چکی تھی۔ طبیعت میں محزونی کا اثر نہ صرف ان کی زندگی بلکہ کلام پر بھی ہوا جس کا کچھ عکس ہم ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ترانۂ وحشت میں دیکھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے شاعر کا کلام صرف اس کی ذاتی زندگی کا عکس نہیں ہوتا بلکہ ایک قادرالکلام شاعر زبان کے گل بوٹے بھی کھلاتا ہے اور قدرتِ بیان کا جوہر بھی پیش کرتا ہے تاکہ قاری پر خوشگوار اور دیرپا اثر قائم ہو وحشت نے خود بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اگر ان کے کلام کو غور سے پڑھا جائے تو کچھ نہ کچھ نیا ضرور ملے گا۔ خیر یہ بحث تو بعد میں آئے گی۔ پہلے دیوان اول کی بات کر لیں۔

تاہم وحشت کی شاعری کا مزاج پہلے ہی دور میں بننے لگا اور وہ اپنے خیالات و افکار غالب کے اندازِ بیان میں شعر کی شکل میں پیش کرنے لگے اور جب 1910 میں دیوانِ وحشت طبع ہوا تو ان کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اس زمانے کے تمام مشاہیر شعرا اور ادبا نے انھیں داد و تحسین سے نوازا۔ ان کے پہلے دور کی شاعری انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کر چکی تھی لہٰذا یہ کہنا کہ ان کی شاعری کا اولین دور تاریک یا مشتبہ ہے، وحشت شناسی کا غلط رویہ ہے۔ اِس دور میں بھی ان کے تخیل کی

بلند پروازی اور افکار کے بہتے ہوئے دھارے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے
خبر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا

چلتا رہا ہمیشہ میں اک طرزِ خاص پر
یعنی فریب خوردۂ دیر و حرم نہ تھا

خیال اس کو اسی کا ہے کہ رسوائی نہ ہو تیری
ترا دیوانہ ایسا ہے کہ رسوا ہو نہیں سکتا

ہوئی گر گفتگو اس سے، نہ آئی بات مطلب کی
کیا تحریر اگر نامہ تو حرفِ مدعا چھوٹا

شدتِ درد سے بے دردیِ جاناں سمجھے
اپنی حالت پہ نظر کی اسے پہچان گئے

تجھ سے رونق آشنا ہے صبح و شام
تجھ سے زینت آفریں ہے شامِ عشق

یوں جو گزرے شبِ فرقت تو شبِ وصل کہوں
میں اسے یاد کروں اور وہ مجھے یاد کرے

اور سہلِ ممتنع میں بھی اشعار دیکھیں۔

جستجو ننگِ آرزو نکلی
درد رسوا ہوا دوا کے لیے

بڑھ چلی ہے بہت حیا تیری
مجھ کو رسوا نہ کر خدا کے لیے

سنگِ طفلاں فدائے سر نہ ہوا
آج اس کوچہ میں گزر نہ ہوا

بیکسی پردہ دارِ درد ہوئی
خیر گزری کہ اپنا گھر نہ ہوا

سر جھکائے جو آتے ہو وحشت
مگر اس بزم میں گزر نہ ہوا

یہ وہ اشعار ہیں جن میں وحشت کی شاعرانہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مشاہیرِ زمانہ کی نظریں ان کے کلام پر ٹھہر گئیں۔ حالی نے لکھا۔

''تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے، الگ کرلیا جائے تو آپ کے دیوان کو بے شائبہ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہوسکتا۔''

شبلی کے الفاظ میں:

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب، جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرزِ ادا آپ سے

خوب بن پڑتی ہیں۔''

ظہیر دہلوی ''یادگار حضرت ذوق'' نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا۔

''آپ کا کلام بلاغت نظام دیکھ کر بخدائے لا یزال
کسی شاعر کا کلام نظر میں نہیں جچتا۔ غالبِ ثانی ہونے میں آپ
کے کوئی کلام نہیں۔ خدا کی قدرت ہے ایسے ایسے باکمال
ہندوستان میں بیٹھے ہیں الھم زد فزد''

مولانا حسرت موہانی اردوئے معلیٰ بابت ماہ اپریل 1915 میں دیوانِ وحشت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ
کے ان برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جن کے حسنِ کلام پر
اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے''

اخبار زمیندار کے مدیر مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت ایک اعلیٰ پایہ تخلیق کار کی رہی ہے۔ اپنے اخبار میں اعلیٰ سے اعلیٰ تر نگارشات پیش کرتے۔ سال 2001 میں ساہتیہ اکادمی ترجمہ انعام لینے کی غرض سے میں دہلی گیا۔ انعامی تقریب کے دوسرے دن ایک پنجابی انعام یافتہ مصنف سے مولانا ظفر کا ایک واقعہ سننے کا اتفاق ہوا۔ مولانا سے کسی نے پوچھا کہ اس مقولے (An arrow shot in the sky and fell like a stick) کا ترجمہ کیا ہوگا جس کی اگر سپاٹ نثر کی جاتی تو یہ ہوتا کہ ایک تیر آسمان پر پھینکا گیا اور تنکے کی طرح پلٹ آیا۔ ہمارے ساتھی مصنف نے ڈرامائی انداز میں بیان کیا'' مولانا حقہ گڑگڑاتے ہوئے تھوڑی دیر غور کرتے رہے اور پھر کہا'' ایک آہ آسمان کی طرف گئی اور آنسو بن کر ٹپک پڑی''۔ اس واقعہ کا علتِ بیان یہی ہے کہ ہمارا علمی ماحول کس نشاۃ الثانیہ پر متمکن ہو گیا تھا اور اردو زبان اتنی طاقتور ہو رہی تھی جو ادبی لحاظ سے کسی بھی بڑی زبان کی ہمسری کر سکے اور اس کار نیک میں ہمارا دانشور طبقہ ہر محاذ پر پیش پیش تھا ایسے اکابرین جو کسی لاؤ لپیٹ کے بغیر اظہار خیال فرماتے وحشت کے دیوان پر زمیندار کے 24 اپریل 1951 کے شمارے میں تبصرہ تھا۔

''مولانا کے دیوان میں سے نمونے کے طور پر کسی حصے کا انتخاب کرنا بوجہ اس کے حشو زائد کے پاک ہونے کے ویسا ہی مشکل ہے جیسا دیوانِ حافظ کا انتخاب کرنا۔ اس قسم کے شکّرین ترانوں سے جنھیں سن کر طبیعت وجد میں آجاتی ہے دیوان بھرا پڑا ہے۔ مولانا وحشت ریختہ گوئی ہی کے فن میں یدِ طولیٰ نہیں رکھتے بلکہ آپ کا فارسی کلام بھی اُستادانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔'' (ترانۂ وحشت)

بہ ایں ہمہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی نے رسالہ ''دل گداز'' لکھنؤ، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی نے رسالہ ''ادیب'' الہ آباد، میرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے رسالہ ''معیار'' لکھنؤ کے تازہ ترین شمارے جو علی الترتیب ماہ اپریل تا مئی 1915 میں شائع ہوئے: دیوانِ وحشت کی خوبیوں اور وحشت کی شاعرانہ خدمات پر اپنے تاثرات پیش کرنے میں بے انصافی نہیں کی۔ اکثر یہ باتیں سننے میں آتی ہیں کہ وحشت کے ساتھ وہ انصاف نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے تو میں یہی عرض کروں گا کہ دیوانِ وحشت کی اشاعت کے محض دو چار برسوں میں جن مشاہیرِ ادب نے جس طرح پذیرائی کی بنگال کے اور کسی شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔

اس کی وجہ بس اتنی ہے کہ وحشت کی نظریں صرف غالب پر ہی مرکوز نہیں رہیں بلکہ انھوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور اردو فارسی کی شاندار روایت اور تخلیقی حشر سامانی سے فیضیاب ہوتے رہے ہر چند فارسی زبان و ادب دانشوروں کی ذہنی پرورش و پرداخت کا موجب رہے لیکن معاشرے میں اس کا چلن کم ہونے لگا تھا جس کی شکایت حالی نے بھی کی اور انھیں اندیشہ تھا کہ شاید اس نوعیت کی شاعری کا دروازہ آئندہ دنوں میں بند ہو جائے۔ حالی کی نگاہِ دوررس نے جو دیکھا، آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وحشت نے اپنی ادبی روایات سے نہ صرف بھرپور کسبِ فیض کیا بلکہ اس کے زندہ رہنے کے اسباب فراہم کرنے میں اپنی شاعری اور نثر کو بطور وسیلۂ اظہار بنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہر چند وحشت کے یہاں تہذیبی کشمکش صاف نظر آتی ہے۔ انھوں نے شیروانی زیبِ تن کرنا کبھی نہیں چھوڑا لیکن عمدہ کیک اور بسکٹ اور کھانے کے ٹیبل پر چھری کانٹے کا استعمال اس پیش و پس کی بہترین مثال ہے۔ شخصیت کا عکس شاعری میں کب اور

کیسے در آتا ہے، اس کا ہوش شاعر کو بھی نہیں ہوتا۔

بہلتا ہے دلِ ناداں تو اپنا
ہے کچھ تو سعیِ لا حاصل سے حاصل

شاعر ان کیفیات کو تلاش کرتا ہے جن کا اثر دیرپا ثابت ہوتا ہے اور جو آنکھوں کو نت نئے زاویے سے ان چیزوں کا عکس دکھلائے جو اس لمحے کے زیرِ اثر ہوتے ہیں اور بعد میں داخلی احساسات کی شکل میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ وہ لمحاتی کیفیت ہے جو انسان کے ذہن کو دھیرے دھیرے کسی شے سے آشنا ہونے کا سبق سکھاتی ہے یہاں تیز قدم کی مات ہو جاتی ہے اور ہر چند کہ رک رک کر چلنے والے یا میانہ روی اختیار کرنے والے اشخاص کسی واقعہ کو پرکھنے میں سست رو کہلاتے ہیں لیکن جزوی طور پر الگ الگ شے کے مختلف چہروں سے روشناس ہوتے جاتے ہیں اور جب ان کے قدم کسی ایک گام پر رک جاتے ہیں تو اسی شے کی مختلف شکلوں کے علاوہ اس کے گرد ہالے کی شکل میں دوسرے عناصر ترکیبی رقص کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک ہنگامہ تو برپا ہے جہانِ دل میں
فکرِ امروز میں اندیشۂ فردا نہ سہی

وحشت نے داخلی احساسات کو جن خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے اور لمحاتی کیفیت کے اثر سے ابلنے والے شدید جذبات کی جس طرح عکاسی کی ہے، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وحشت کی آنکھیں صرف ریگ زار کی اڑتی ہوئی ریت اور بگولوں کا رقص نہیں دیکھتیں بلکہ ان کے کان ریت کے اندر جاری آبِ رواں کی گنگناہٹ بھی سنتے ہیں۔ سطحی معنویت سے گریز کرتے ہوئے کسی ایک کیفیت کی سن گن لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نگاہ جزئیات سے آشنا تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی بے حقیقت باتوں میں ایک لطف پیدا کر دیتے تھے۔

عشقیہ مضامین

محبت انسانی رشتے کی معراج ہے جو ایک وسیع و عریض دنیا کو جذباتی کڑیوں میں پرو دیتی ہے۔ وحشت کے عشق کے دو پہلو ہیں۔ اول یہ کہ جزو کل سے ملنے کو بیتاب ہے اور اس کی اپنی شخصیت کچھ بھی نہیں ہے اور جو وصف حاصل ہے وہ یکہ و تنہا نہیں ہے بلکہ اس میں کسی کی کبریائی

شامل ہے۔ یہاں عشق تسکین روح وقلب کا متلاشی ہے جس کی کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے۔

خاک میں مل گئے ولے آنکھ اٹھی نہ شرم سے
ہم سے ہوا نہ حق ادا اس کی نگاہِ ناز کا

جلوہ کس آئینہ رو کا ہے نگاہوں میں کہ پھر
دلِ حیرت زدہ آئینہ بناتا ہے مجھے

خلقت فدائے صنعتِ خلقت طراز ہے
آئینہ محوِ جلوۂ آئینہ ساز ہے

اردو شاعری کی روایت میں عشق کی دوسری صورت مجازی ہے۔ ہمارے بڑے شعرا اس روایت میں کچھ ایسے گل بوٹے کھلائے ہیں جس میں دونوں قدریں کہیں بالکل واضح اور منفرد نظر آتی ہیں اور کہیں یہ تصویرِ مجاز کے پردۂ مجمل میں اپنی الگ حشر سامانیاں پیش کرتی ہیں۔ غزل کی رسمیات میں محبوب کی بیگانہ خوئی اور عاشق کی نامرادی کا گلہ ہے جس سے اردو شاعری کا معتدبہ حصہ بھرا پڑا ہے اور شاعری میں عشقیہ مضامین پیش کرنے کی شاعرانہ ریاضت اور اس روایت کے فروغ میں اس کی قدر و قیمت سے انکار ناممکن ہے۔ اس اندازِ تغافل کا نازک پہلو یہ ہے کہ اس سے عشق کم نہیں ہوتا بلکہ فزوں ہوتا ہے اور کسی نہ کسی طرح وہ معشوق کے دائرۂ اثر میں رہتا ہے۔ وحشت کے یہاں عشقیہ مضامین مختلف جگہوں پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے یہاں محبوب کا تصور ایک ایسی ہستی کا تصور ہے جو حسرت کے معشوق کی طرح سرگرم نہیں ہے لیکن وحشت کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہاں ایک اصرار نہیں بلکہ توکل ہے، احساسِ محرومی ہے اور یہی احساس وجہِ انبساط بھی ہے اور وجہِ انبساط پیدا کرنے کے لیے مضمون نہیں بلکہ وحشت اشعار میں زبان کی نیرنگی کا استعمال کر کے لطف اٹھاتے ہیں۔ وہ تغافل کا جواب تغافل سے دیتے ہیں۔ لہٰذا جس شمشیر سے زخم پیدا ہوتا ہے، وہی زخم پھول بن جاتا ہے لہٰذا اس بے اعتنائی سے معشوق میں اضطراب پیدا ہونا فطری ہے لہٰذا وحشت بھی در پردہ وہی کام کر رہے ہیں جو معشوق کر رہا ہے۔

مستیِ بے خودی سے یاں آنکھ کھلی نہ حشر تک
یعنی یہی جواب تھا نرگسِ نیم باز کا

کس کو خبر نہیں ہے کہ دیتا ہے وہ فریب
یاں تو فریب کھانے کی عادت ہے کیا کروں

نہ وفا میں نے کبھی کی، نہ جفا آپ نے کی
مجھ کو بھی یاد نہیں، آپ کو بھی یاد نہیں

لطف آتا ہے مجھے حسرتوں کا کرتے ہوئے ذکر
جب وہ کہتے ہیں ترے سر کی قسم یاد نہیں

حد سے گزر گئی ہیں تری بے وفائیاں
اب تک مگر فریبِ وفا کھا رہا ہوں میں

کیا جانے کہاں سے دلِ مضطر میں لگی آگ
کس گھر سے اٹھی آگ کہ اس گھر میں لگی آگ

پیدا ہوا کچھ ایسا تلاطم خیال میں
شب ہائے ہجر کٹ گئیں شوقِ وصال میں

وحشت کی نظر میں غم لذتِ حیات کا سبب ہے۔ غم کی چہار دیواری میں مقید رہنے والے وحشت مایوسی کی تنگ و تاریک گلیوں میں چراغِ عمل جلانے پر یقین رکھتے ہیں۔ غم کی لذت خوشی کی کیفیات پر حاوی نظر آتی ہے۔ وقتی خوشی کے بدلے غم درد و یاس کا لامتناہی سلسلہ دراز کرتا ہے جو

وحشت کے لیے لطف وانبساط کا وسیلہ بن جاتا ہے۔اس خیال کی روشنی میں وحشت کا یہ شعر

الم کشانِ محبت نے کب کہیں دیکھا
وہ غم کہ جو سببِ لذتِ حیات نہیں

ان کی غمزدہ زندگی کے بند دریچوں کو وا کرتا ہے جو اس وقت وحشت کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر نہیں ہوئی تھی۔وہ اپنے اندر کی کیفیتوں کو اجاگر کر کے سامع کو ملول کرنا نہیں چاہتے تھے اور یہیں سے ان کی شاعری دوسرے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔

غزل اپنی مجھے پڑھتے ہی بنے گی وحشت
پاسِ احباب سہی دل کا تقاضہ نہ سہی

بگڑ جاتے ہیں اپنے کام سارے تو بگڑ جائیں
طبیعت کو ہرا بن الوقت کی تقلید مشکل ہے

للہ الحمد نہیں بار کسی پر اپنا
میں تونگر نہیں پر دل ہے تونگر اپنا

انسان کے داخلی احساسات یا جذبات جب اندر اندر کھولتے رہیں اور وسیلۂ اظہار نہ پائیں تو یہ مختلف قسم کے جذبات کو جنم دیتے ہیں۔اس عمل کے ذریعہ وجود میں آنے والے شدید جذبات انسان کی نفسیات بن کر رہ جاتے ہیں۔اس سے نجات اس کرب سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہی ملتی ہے جسے وہ جھیلتا ہے۔واقعہ یوں ہے کہ اگر ہم کوئی شے اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں اور غیر شعوری طور پر وہ شے پھسل بھی جاتی ہے لیکن ہم اپنی ہتھیلی سے اس شے کی موجودگی کے احساس کو اس وقت تک زائل نہیں کر سکتے ہیں جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ ہتھیلی خالی ہو چکی ہے علاوہ ازیں اگر وہ شے اتنی ہی اہم ثابت ہوئی کہ اس کے لیے کفِ افسوس ملے جائیں تو ہم ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں جو ایک عرصے تک اس گمشدگی کے سبب ہونے والے نقصانات کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔عموماً انسان اس طرح کے جذبات کو بہت کم برداشت کرتا ہے۔گمشدہ شے نئے جذبات فراہم کرتی ہے اور انسان کی فطری

صلاحتیں جاگ اٹھتی ہیں نتیجتاً غم وغصہ، احتجاج، جھنجھلاہٹ اس کے رویے سے عیاں ہونے لگتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ان سب چیزوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے عادات واطوار میں تبدیلی لانا چاہتا ہے۔ بعض کیفیات کو آشکار کرنے سے بہتر اسے پوشیدہ رکھنے کو سمجھتا ہے لیکن ایسا کرنا اس فعل کو یہیں ختم نہیں کر دیتا۔ انسان اپنے اس شعوری احتجاج کو قوتِ ارادی کے ذریعہ دبا تو سکتا ہے لیکن ختم نہیں کر سکتا چنانچہ ایک ہلکی سی غیر شعوری لرزش دوبارہ اس شے سے وابستگی پیدا کر دیتی ہے۔ جذبات یا احساسات کو روکنے کی انتہائی کوشش ان نفسیاتی کیفیات کو پیدا کرتی ہے جو دائمی ہیں۔

وحشت کے آخری ایام کی شاعری اسی کیفیت سے عبارت ہے اور ان تمام رازہائے سربستہ کو منکشف کرتی ہے جس کے ایندھن میں وحشت جلتے رہے۔ شعوری طور پر وہ اپنے داخلی جذبات کو جو روز بروز شدت اختیار کرتے جا رہے تھے، پوشیدہ رکھنے کی سعی کرتے رہے لیکن پے در پے حادثات کی یورش، اولاد کے ذہنی خلل میں مبتلا ہو جانے کا غم، وطن کی محبت، زمانے کے نشیب وفراز اور اس کا ردِ عمل شدید طور پر نمایاں ہونے لگا ہے اور اس طرح وحشت کی شاعری کروٹ لینے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ زمانے کے سرد وگرم، قومی وملی تحریکات کے اثرات کا عکس بھی ان کی شاعری میں اُبھرنے لگا تاہم جو بھی ہے اس کے اپنے آداب ہیں۔ اس طرح غالب کی زبان اور مومن کے رنگِ تغزل کے ہمراہ وحشت بڑے آب وتاب کے ساتھ خود کو اپنے عہد کے مسائل سے بھی نبرد آزما ہوتے دکھائی دیتے ہیں جس سے آج تک کسی بھی تخلیقی فن کار کو مفر نہیں رہا۔

عذر معقول نہیں بے سروسامانی کا
چاہیے حیلہ کوئی سلسلہ جنبانی کا

کیوں شیوۂ استغنا ہو وجہِ پریشانی
اے آہِ سحر گاہی کر سلسلہ جنبانی

یہ وہ اشعار ہیں جو وحشت کے دوسرے دور کی شاعری کی شناخت کے لیے معاون ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے یہاں خارجی واقعات کا ردِ عمل بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جس سے ہماری قومی وملی شاعری وجود میں آئی۔ ان اشعار میں وہی باتیں ہویدا ہیں جو آج کے دور کی انفرادیت

ہے۔قدروں کی پامالی، زر پرست انسان کا ایک دوسرے سے بیگانہ پن، بے عملی اور مشینی دور کی ابتدا اس شعر میں نہاں ہے۔

بہا جاتا ہے اپنی اپنی رو میں دیکھیے جس کو
کسے فرصت کہ سوچے مقصدِ بانگِ درا کیا ہے

لازم ہے کارواں کو رہے آپ مستعد
شرمندۂ صدا جرسِ کارواں نہ ہو

اس مقام پر پہنچنے کے بعد مولانا اس فکر کی تلاش میں محو ہو جاتے ہیں جن کے اثرات ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر نمایاں ہوئے یا ان آوازوں کی بازگشت پر کان دھرنے لگتے ہیں جس سے وحشت کی ایک عجیب شخصیت ظاہر ہوتی ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر جزو کل کی وادی میں سربستہ رازوں کو منکشف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ان کا عمل کوئی منصوبہ بند نہیں بلکہ وہ شدید جذبات کی رو میں بہنے لگتے ہیں۔اپنی اس جمالیاتی حس اور ذہنی صعوبتوں کو جس مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں، ان کیفیات کا ذریعۂ اظہار صرف شعر ہی ہو سکتا ہے جو اپنے نرم اور اچھوتے پیکر میں ایک مترنم لے چھپائے رکھتا ہے اور انسانی ذہن کو اپنی جانب متوجہ کر لینے کی کشش بھی۔

ہے مری گمشدگی میرا نشانِ منزل
مژدہ خود دیتی ہے مشکل مجھے آسانی کا

بس اک شکلِ تقاضائے جنوں ہے جستجو میری
مجھے شوقِ سفر کیا چین لینے دے گا منزل میں

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

مقامِ شکر ہے اک وقت ایسا آ پہنچا
کہ دل کے حال سے خود دل کو آگہی نہ رہی

دل ہے تکلف آشنا، لطف ہے جب کہ دیکھیے
بادۂ لعل فام کو ساغرِ زرنگار میں

ہزاروں خواہشیں تکمیل کا، جن کا تقاضہ ہے
تری دنیا نہیں ہے یہ تو اک دامِ تمنا ہے

وحشت اک فکرِ عبث ہے ہوسِ آزادی
دہر وہ دام ہے جس سے کوئی آزاد نہیں

قومی وملی تحریکات کا اثر

وحشت کی عمر کا درمیانی زمانہ بین الاقوامی سطح پر پیہم حادثات کا زمانہ ہے۔قدروں کا انحطاط، پیروں میں غلامی کی زنجیر، دوسری جنگ عظیم اور دوسرے سیاسی وغیر سیاسی رجحانات رونما ہو رہے تھے۔نسلوں کی تقسیم کے پس پردہ گوروں کی شاطرانہ چالیں تاریخ میں ایک سیاہ باب کا اضافہ کر رہی تھیں۔ایسے ہنگامی حالات سے ہر انسان متاثر ہوتا ہے۔ بالخصوص نرم جذبے کی شناخت کرنے والے ٹوٹتے بنتے دائروں کے ہر عمل پر نگاہ رکھتے ہیں۔شدید خارجی اثرات انسان کی زندگی میں براہ راست داخل ہو جاتے ہیں۔چونکہ انسان کا ذہن ہر اس شے سے مانوس ہوتا ہے جس کا رشتہ روح یا جسم سے ہوتا ہے۔وحشت نے ان کیفیات کو جس طرح شعری آہنگ دیا ہے وہ حسن وعشق کے رموز سے مستثنیٰ ایک عہد کا تقاضہ ہے۔

جگر لاؤں کہاں سے میں جو تاراج خزاں دیکھوں
انھیں آنکھوں سے کل رنگینیاں دیکھی ہیں گلشن کی

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیِ چمن کے لیے

ترے غمزے لڑا دیں گے مسلماں کو مسلماں سے
ترے عشوے بھڑا دیں گے برہمن کو برہمن سے

اور انھوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی اور تنزلی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

مزے کی زندگی ہے وقت بیکاری میں کٹتا ہے
نہ ہے امروز کی کچھ فکر نہ اندیشۂ فردا

اوامر سے ہمیں غفلت نواہی سے ہمیں رغبت
کیا ہے نام روشن ہم نے بھی اسلام کا کیسا

مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں اپنی محفل میں
توجہ کے ذرا قابل نہیں دنیا و مافیہا

کہیں ہے فاقہ مستی اور کہیں عشرت پرستی ہے
غرض جو بات ہے اپنی سراسر ہے وہ نازیبا

ہوئی ہے مبتذل اس دور میں یوں قوم کی حالت
یقیں آتا نہیں اپنے گزشتہ عہدِ ماضی کا

(نالۂ غم)

مذہب کی حرارت کے بھڑکتے نہیں شعلے
ہاں آتشِ خاموش کا تھوڑا سا دھواں ہے

سنتا نہیں اک سمت سے بھی حرفِ تسلی
دل حلقۂ ماتم میں بہرسو نگراں ہے

اے شانِ جلالی تری غیرت کو ہوا کیا
مٹ جائیں گے مسلم یہ حریفوں کا گماں ہے

(خروشِ یاس)

وحشت کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزرا۔ کلکتہ ان کی روح تھا۔ یہاں کی مجلسیں، دعوتیں ان کو بھولے نہیں بھولتی تھیں حالانکہ وحشت نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ حالات کے دھارے چاہے کتنے ہی سرکش کیوں نہ ہوں، وہ سرزمینِ کلکتہ سے جدائی ہرگز برداشت نہیں کر سکتے لیکن اعتماد کا یہ ستون بھی گر پڑا۔ وحشت مایوس ہوگئے۔ کلکتہ کی محفلیں اجڑ گئیں لیکن کلکتہ سے ہجرت کے بعد بھی یہ شہر اسی طرح روشن تھا۔

زمیں ڈھاکہ نے کی قلب پہ افسردگی طاری
ہوا خلوت نشیں میں اور شوقِ انجمن چھوٹا

وطن اور وہ بھی کلکتہ غضب تھا چھوٹنا اس کا
قیامت ہوگئی وحشت سے وحشت کا وطن چھوٹا

خاموش ہیں لب لیکن یاد آتے ہیں وہ دن بھی
جب مجمعِ یاراں میں ہوتی تھی غزل خوانی

جو قدر کی وطن نے وہ ہے دل پر اپنے نقش
کیا یادگار لے کے چلے ہیں وطن سے ہم

مجبور ہو کے میں نے لگائی لبوں پہ مہر
کیا لطفِ گفتگو جو کوئی ہم زباں نہ ہو

کلامِ وحشت کی انفرادیت

بنگال کی اردو غزل کو رضا علی وحشت کی غالب سرائی سے یہ فیض پہنچا کہ یہاں کی غزل داغ اور امیر کی غزل گوئی کے اثرات سے نکل گئی کہ وحشت کے استاد ابوالقاسم شمس داغ کے شاگرد تھے۔ دوسری طرف نظم گوئی کے بڑھتے رجحان میں جب شاعری کا رشتہ غزل سے منقطع ہو رہا تھا تو مشرقی ہند میں وحشت کی غزلوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور پورے ہندوستان میں اس کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف شاید اس احساس کی تسکین بھی ہو رہی تھی کہ درزبانِ دہلوی مشرقی ہند میں بھی اشعار کہے جا سکتے ہیں نیز جس سرزمین نے غالب کی فارسی دانی پر سوالات کھڑے کیے اسی سرزمین پر ان کا اتباع بھی کیا گیا لیکن برا ہو ہمارے ناقدین کا جنھوں نے وحشت کو غالب دوراں بنانے کی فکر میں ان کی غزلیہ خدمات کو پسِ پشت ڈال دیا حالانکہ ان کا مقام حسرت، فانی، اصغر اور یگانہ جیسے غزل کے احیا کار شعرا کے ساتھ محفوظ و مامون ہے۔

وحشت کو اُن کی زندگی میں ہی ایک نوع کی فضیلت حاصل ہو گئی تھی اس لیے بھی کہ وہ زبان اور شعر کے تاریخی عمل سے غافل نہیں تھے۔ ولی پر مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔ کلامِ ولی کا مطالعہ ہمیں اس نکتۂ نظر سے کرنا چاہیے کہ انھوں نے اس زبان میں شعر کہہ کر نہ صرف یہ کہ اس میں صفائی پیدا کی بلکہ اسے روزمرہ کے قابل بنا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آج ان کی زبان نامانوس لگے ٹھیک اُسی طرح جس طرح آنے والے لوگ آج کی زبان کو رد کر دیں گے۔ اسی فن کارانہ احساس

نے ان کے اندر شاعری اور ادب کے کلاسیکی قدروں سے متعلق ایک منفرد رویہ پیدا کر دیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اُن کی شاعری میں نئے زمانے کے تقاضے اور نئے میلانات کا شائبہ نہیں ہے یا یہ کہنا کہ ان کی شاعری دل کی نہیں بلکہ دماغ کی کاوش کا عطیہ ہے، دراصل وحشت شناسی کا غلط رویہ ہے۔ غزل کا شاعر بھی ایک دھڑکتا ہوا گداز دل رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ غزل کی زبان اور نظم کی زبان میں واضح فرق ہے، اسلوب کی سطح پر بھی اور مضامین کی سطح پر بھی۔ غزل ایجاز کا فن ہے اور نظم جزئیات نگاری کا ہنر! جن لفظیات کا نظم میں آزادانہ استعمال کیا جا سکتا ہے، غزل میں انھیں لفظیات کے سہارے اپنا مافی الضمیر بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ بحروں کا التزام ہے بعض الفاظ کا استعمال بعض بحروں میں ممکن نہیں اور کبھی کھینچ تان کر مصرعے مکمل ہو بھی جاتے ہیں تو شاعری منھ موڑ لیتی ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں غزل میں تخلیقی عمل آہنگ سے شروع ہوتا ہے اور پھر آہنگ کے سہارے خیال تک اور خیال کی تجسیم کے لیے لفظیات کا انتخاب جیسے فریم میں فن کے جوہر دکھانا کسی معمولی ذہن کا کام نہیں۔ صرف موزونیِ طبع کے سہارے مصرعے جوڑنا اور بات ہے۔

تنقیدی محاکمہ

شعری رویہ

اردو شاعری کی ترویج واشاعت میں جو عوامل کارفرما رہے ہیں، ان میں سب سے اہم استادی اور شاگردی کے رشتے کے حوالے سے شاعری کے رموز سے آگاہی حاصل کرنا ہے بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں استادی اور شاگردی کی روایت نے زبان اور شاعری کی بنیادوں کو مضبوط کیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ مشہور زمانہ استاد شعرا کے سامنے نومشق شعرا زانوئے تلمذ تہہ کرتے بلکہ استاد بھی اپنے شاگردانِ رشید کو شاعری کے رموز ونکات سکھانے کے ساتھ ساتھ صحتِ زبان کے اصول سے واقف کراتے۔ ان اساتذہ کے نزدیک شاعری کے لیے اولین شرط صحتِ زبان ہی تھی۔ ہر چند کسی بھی طرح کی تخلیق کا عمل وہبی اور وجدانی ہوتا ہے تاہم زبان کی نزاکتوں کو سمجھے بغیر احساسات کا لمس محسوس کرنا نیز تخئیل کو لفظیات کے قالب میں ڈھالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ ہر چند استادی اور شاگردی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے تاہم اس خیمے کی طنابیں کمزور ہو رہی ہیں اور اس صحت مند روایت میں شگاف پیدا ہونے لگے ہیں۔ یہاں اس بات کا اظہار نامناسب نہیں ہوگا کہ اس زوال کی ذمہ داری یقیناً ان کے سر جاتی ہے جو شاعری کو صنفِ محض، خالی خولی دماغ سوزی کا فن اور وقت گزارنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں بلکہ اب تو ایسا بھی سننے میں آنے لگا ہے کہ فی

زمانہ جب وقت گزاری کے نئے نئے نمونے اور عوامی اظہار کے چشم کشا وسائل پیدا ہو گئے ہیں تو کوئی شعر سے معنی کشید کرنے کا جوکھم کیوں اُٹھائے۔ کچھ لوگ ایسا کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کیونکہ اگر بات صرف تفریح اور دلجوئی کی ہے تو پاپولر میڈیا نے انسان کے لیے وقت گزاری کے آسان اور سستے مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ ظاہر ہے شاعری سے اس نوع کی امید رکھنے والے تماش بین تو ہو سکتے ہیں، شاعری کے سنجیدہ قاری اور اپنی تہذیب کے ثنا خواں نہیں ہو سکتے۔ میں یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے سامعین جو کسی سنجیدہ اور باوقار صنف سے تفریح کا رشتہ رکھتے ہیں، وہ کبھی بھی منظر نامہ بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کوئی نئی راہ اپنا سکتے ہیں تاہم یہ معاملہ یکطرفہ نہیں ہے۔ اس بات کو بار بار یاد دلانے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ شاعر سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اور شاعری کا ایک سماجی عمل بھی ہے لہٰذا اس کا ایک منصب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے لیے زمین ہموار رکھنے کے لیے مسلسل ماحول سازی کرتی رہے اور اسی ماحول کے زیرِ اثر نابغۂ روزگار منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اگر کسی بھی زبان کی شاعری اس سماجی عمل سے منہ موڑتی ہے تو وہ ڈرائنگ روم کی زینت بن جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وحشت کو ان کے معاصرین نے یا تو غالبِ دوراں اور غالبِ ثانی وغیرہ وغیرہ بنا کر پیش کیا ہے یا پھر وہ اتباعِ غالب کی کامیابی اور ناکامی میں الجھ کر رہ گئے، اس کے کسی حد تک ذمہ دار وحشت ہی ہیں۔ انھوں نے خود کو چراغ سے چراغ جلانے کی روایت سے جوڑ رکھا تھا لہٰذا متاخرین بھی اسی تاثر کا تعاقب کرتے رہے جس کے نتیجے میں ہماری معاصر تنقید بھی اُسی راہ پر نکل پڑی۔ غالب کا بت اتنا بڑا ہے کہ اُس کے فسوں کو توڑنا عام صلاحیت کے لوگوں کے بس کی بات نہیں بلکہ شاعری ان معنوں میں فسوں توڑنے کا نام نہیں ہے، یہ کاروبارِ دل ہے اس میں جو جتنا لٹتا ہے، اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ شاعری اصرار کرتی ہے کہ کوئی اس کے فسوں میں بار بار گرفتار ہو اور سلامت باہر نکل آئے۔ غالب سرائی کا جو رجحان تھا وہ دراصل ایک روایت کی توسیع تھی۔ اردو کا فکری خزانہ فارسی اور عربی کے فکری خزانوں سے معمور ہو رہا تھا اس لیے اردو زبان کے لیے فارسی اور کسی حد تک عربی ادبیات ہی اپنی لسانی ہم آہنگی کی وجہ سے Source of sustenance تھی۔ غالب نے بہت سے خیالات فارسی سے اردو میں منتقل کیے۔ اقبال

نے بھی یہی کام کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو زبان میں خیالات اور فکر پیدا کرنے اور ان پر سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ ایسی بیشتر مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو اس بات کی غمازی کریں گی۔ اردو کی رگوں میں اول اول تو فارسی خون ہی دوڑ رہا تھا۔ شعرا نے اپنے قدما کی روش اختیار کرتے ہوئے روایت کی پاسداری کا فریضہ انجام دیا۔ غالب کہتا ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

وحشت نے تو اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔

سخن آموختہ غالب از نظیری وحشت از غالب
چراغے را کہ دودے ہست از سر زود در گیرد

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ دیوانِ وحشت کو اس عہد کے تمام اہم شعرا نے نہ صرف حوصلہ افزا کلمات سے نوازا بلکہ کسی حد تک وہی قدر و قیمت متعین کر دی جو وحشت چاہتے تھے ''یعنی غالب دوراں ہونا'' تاہم الطاف حسین حالی کے نزدیک اس کی اہمیت دو معنوں میں تھی۔ اول یہ کہ جس خطے میں غالب کی زبان دانی پر تنقید ہوئی اور مثنوی بادِ مخالف ظہور میں آئی یہی نہیں بلکہ غدر کے بعد غالب کی کتاب قاطع برہان کے خلاف احمد رئیس (احمد علی بیگ کلکتہ) نے بقول حالی نہایت درشت لہجے میں ''ایک مستقل کتاب 'موئید البرہان' شائع کی حالانکہ احمد علی بیگ نے اپنی ذاتی رنجش کے سبب سفرِ کلکتہ کے دوران کچھ لوگوں کو غالب کی کردار کشی پر لگا دیا تھا تاکہ پنشن کے سلسلے میں ان کی عرضداشت کا کوئی نتیجہ نہ نکلے لہٰذا ایک غیر ادبی واقعہ سے ایک ادبی معرکہ جنم لیتا ہے جس کے نتائج سے ہم سب واقف ہیں اور اسی واقعہ کے تقریباً چار دہائی کے بعد اسی خطے کا پروردہ نئی نسل کا وحشت جیسا شاعر غالب کی پیروی کرتا نظر آتا ہے لہٰذا جذبات سے مغلوب ہو کر حالی نے پُرتکلف بیان دیا کہ یہ حق ان (غالب کے شاگردان) کا تھا جسے وحشت نے چھین لیا لیکن جب موازنہ کی بات آئی تو انھوں نے تکلف چھوڑ کر ایک محتاط اور نپی تلی رائے پیش کی۔

''تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے
خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، مستثنیٰ کر لیا

جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بے شائبہ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہوسکتا اور چونکہ ایشیا کی قدیم شاعری بظاہر چراغِ سحری معلوم ہوتی ہے اور فارسی زبان ہندوستان سے آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جاتی ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ کیا اردو اور کیا فارسی دونوں زبانوں میں ایسے نئے دیوانوں کے شائع ہونے کی امید کم ہے''

مولانا حالی نے وحشت کے تعلق سے جو رائے پیش کی، اس میں کوئی بناوٹ اور تصنع کی بات نہیں تھی اور حالی سے اس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تاہم انھوں نے جس اعتبار سے کلامِ وحشت کی تحسین کی اس میں غالب نوائی تو تھی ہی ساتھ ہی اردو اور فارسی شاعری کے تعلق سے قدروں کی تشویشناک حد تک بدلتی صورت حال پر بھی مولانا حالی نے اظہار کیا اور جسے وہ قدیم شاعری کہہ رہے ہیں، دراصل وہ ہماری تہذیب کی کڑیاں ہیں جس کے لخت لخت ہونے کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور کیا فارسی کیا اردو شاعری کی مرکزیت اور حکیمانہ خیالات کو پیش کرنے کے لیے جس مضبوط زبان کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے آثار معدوم ہو رہے تھے اور ایک بڑا تہذیبی سرمایہ ہماری دسترس سے دور ہونے لگا تھا۔ حالی کی تشویش کس حد تک قرینِ قیاس تھی، اس کا اندازہ اہلِ نظر یقیناً لگا سکتے ہیں۔

بہرِ نو بہت سارے لوگ بس اسی سوال پر ہی آتشِ زیرِ پا ہو گئے کہ کہاں غالب اور کہاں وحشت۔ اس بات کو غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ دیوانِ اول وحشت کا ابتدائی کلام ہے اور جس وقت اس کی اشاعت ہوئی تو وحشت نے اپنی عمر کے 30 سال بھی پورے نہیں کیے تھے۔ اتنی کم عمری میں شاعری کا اتنا گہرا رنگ بہت کم لوگوں پر چڑھتا دیکھا گیا ہے اور ایسے ایام کی شاعری زیادہ تر رسمی اور تقلیدی ہوتی ہے اور کوئی بھی شاعر اس عیب سے بچا نہیں لیکن جو بات بے حد اہم ہے اور جس کی بنیاد پر وحشت کے کلام کی پذیرائی ہوئی، وہ یقیناً زبان پر ان کی دسترس اور اظہارِ خیال پر قدرت تھی جس نے دیوانِ وحشت کو زمانے میں اعتبار بخشا۔ شاید غالب بھی یہی چاہتے تھے کہ شاعری کی ایسی زبان خلق کی جائے جس کی نہ صرف دیرپائی قائم رہے بلکہ ہر نئی نسل کے لیے وسیلۂ اظہار کا سرچشمہ ثابت ہو۔

جہاں تک غالب کی تقلید کا معاملہ ہے، ان کے کسی بھی اہم معاصر نے دیوانِ وحشت کو ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے لکھا۔

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے، غالب اور مومن کی طرزِ ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں''

علامہ اقبال بھی وحشت کی شاعری کے پرستار نظر آتے ہیں۔ دیوانِ وحشت شائع ہوا تو اقبال نے وحشت کے کلام کا مطالعہ کرنے والا اور ان کے تئیں اپنی غائبانہ مداحی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔

''دیوان تقریباً سب کا سب پڑھا، خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابلِ داد ہے۔ فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے پر چھوڑ جائے تو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے''

جیسا کہ میں نے عرض کیا، 20ویں صدی میں غالب بذاتِ خود ایک ٹرینڈ بن گیا تھا اور غزل گو شعرا اس کے گرویدہ ہو گئے۔ صفی لکھنوی تا وحشت طرزِ غالب میں امکانات تلاش کرنا بجائے خود ایک تحریک بن چکی تھی۔ کیا شرق اور کیا غرب جہاں جہاں مشکل پسند اور نئی طبیعت کے لوگ تھے، رنگِ غالب اپنانے کے ٹرینڈ میں شامل ہو گئے۔ کچھ نے اسی اتباع سے اپنا لہجہ دریافت کر لیا اور کچھ محزونیِ طبیعت کا بار اٹھاتے ہوئے اپنے خول سے باہر نہیں نکل سکے۔ وحشت نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر اُن کے کلام کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے بھی کچھ نہ کچھ نیا ضرور پیش کیا ہے۔ مولانا معصومی علامہ کے اس خیال کو اُن کی انکساری پر محمول کرتے ہیں لیکن ل۔ احمد اکبر آبادی وحشت کی غزلوں میں اعلیٰ تخئیل اور نازک خیالی کے سبب کلامِ وحشت کو غالب کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ دیوانِ وحشت کی پہلی غزل کا مطلع (ثانی) سنتے ہی وہ پھڑک اٹھتے ہیں۔

''حافظے میں وہ سنہ تو محفوظ نہیں رہا لیکن دیوانِ وحشت شائع

ہوا تو پیکٹ اس وقت پہنچا جب میرے پاس بعض شاعر و ادیب دوست بھی موجود تھے۔ پیکٹ کھولا گیا اور جیبی جائسی نے پہلی غزل کا مطلع بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

پایہ بہت کیا بلند اس نے حریم ناز کا
تا نہ پہنچ سکے غبار رہ گزر نیاز کا

تو ہم سب پر خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ گردنیں جھک گئی تھیں اور ہم سب شاید وہاں جا پہنچے تھے جس مقام پر پہنچ کر جناب وحشت نے یہ شعر نظم کیا تھا'' (کلام وحشت کا ترقی پسندانہ پہلو)

وحشت کی غالب نوائی

پہلی بات تو یہ کہ میں غالب اور وحشت کا موازنہ نہیں کرنا چاہتا اور کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص انفرادی طور ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہماری بلکہ دنیا بھر کی شاعری میں تشبیہہ اور استعارے وغیرہ کا استعمال ہی نہیں ہوتا، یہ بات سب جانتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ غالب کی ترجیحات اور وحشت کی ترجیحات میں بین فرق محسوس کیا جاسکتا ہے (ایسا دوسرے شعرا کے ساتھ بھی ہوتا ہے)۔ اب رہ جاتی ہے بات مماثلت اور امتیاز کی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحشت نے پیروی غالب میں غالب کے اسلوب شعر سے اور کہیں کہیں معنی سے بھی کسب فیض کیا تو ظاہر ہے ہم کلام وحشت کو کلام غالب کا قائم مقام تسلیم نہیں کر سکتے بلکہ جو ذرہ جس جگہ ہے یا تو ذرہ ہی رہ گیا یا اپنی روشنی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ وحشت نے دراصل غالب نوائی کی۔ ہمارے زیادہ تر اکابرین فن شاعری نے یہی طرز اپنایا کہ غالب اور وحشت کے اشعار کا موازنہ کر کے یہ ثابت کریں کہ وحشت کو غالب زمانہ کہنے کا جواز یہ اشعار کس حد تک فراہم کرتے ہیں۔ (جس کا ذکر آگے آئے گا) بعض حضرات اس اثر انگیزی کو ثابت کرنے کے لیے مضمون کا سہارا لیتے ہیں حالانکہ وحشت کا خیال ہے کہ۔

نکتہ پردازی میں وحشت پیرو غالب ہوں میں
سرمہ کو کہتا ہوں درد شعلۂ آواز ہے

آیئے وحشت کی ایک مکمل غزل پڑھتے ہیں جس میں انھوں نے مقطع میں بطرزِ میرزا غالب غزل پیش کرنے کی فرمائش کی۔ ملحوظ رہے اس غزل پر وحشت نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ انھوں نے میرزا کی طرز حاصل کرلی ہے۔

رہیں جاری کہاں تک اشکِ خونیں دیدۂ تر سے
لہو پانی ہوا جاتا ہے جب ظالم ترے ڈر سے

قتیلِ عشق اگر نالاں ہوا بیدادِ دلبر سے
الٰہی ہو نہ لذت یاب لطفِ آبِ خنجر سے

رہِ سیلاب بھی پنبہ سے کوئی بند ہوتی ہے
اٹھالو اپنا دامن تم ہمارے دیدۂ تر سے

ترے لب تشنگانِ شوق مرکر بھی رہے پیاسے
کوئی صورت کشادِ کار کی نکلی نہ خنجر سے

ادھر آ ساقیِ پاکیزہ طورا اے مہرباں میرے
مجھے مسرور کر اک پُرتکلف ساغرِ زر سے

دفورِ اضطرابِ شوق سے دل کے عجب کیا ہے
کرے پروازنامہ چھوٹ کر بالِ کبوتر سے

یہ پانی پانی ہوجانا ندامت سے ندامت ہے
عبث ہے ابر کو چشمک ہمارے دیدۂ تر سے

گدائے میکدہ ہوں بوئے مے بس ہے تسلی کو
غرض ہے مجھ کو شیشے سے نہ مطلب مجھ کو ساغر سے

تمھارے ہاتھ میں رنگِ حنا ہے ہم نہ مانیں گے
یہ قطرے خون کے ٹپکے ہیں کس کے قلبِ مضطر سے

یہ حالِ اضطرابِ شوق تھا فصلِ بہاراں میں
کہ دل کے زخم کھجلاتے رہے ہم نوکِ نشتر سے

مگر جذبِ محبت دے انھیں توفیق پرسش کی
کھڑے ہیں دور وہ اپنے مریضِ غم کے بستر سے
سُنا تازہ غزل کوئی بطرزِ میرزا غالب
کہ یہ بزمِ سخن خالی نہیں وحشت سخنور سے

وحشت کی زیادہ تر غزلیں مختصر ہیں لیکن طویل غزلوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ ایسا لگتا ہے طویل غزلوں کے معاملے میں وحشت طبعِ رواں کے زور پر شعر پر شعر کہتے گئے۔ مذکورہ غزل بھی ان کی طویل غزلوں میں ایک ہے۔ اس غزل سے دو باتیں صاف ہیں کہ غزل کا اسلوب وحشت کے معاصرین سے مختلف ہے۔ اشعار میں لہجے کی یکسانیت ہے۔ کچھ لفظیات جو غالب کی شاعری میں نظر آتے ہیں، وہ بھی موجود ہیں۔ ترکیبوں میں نیا پن ضرور ہے تاہم غالب مژگاں سے نوکِ نشتر کا کام لیتے ہیں۔ مطلع نے ضرور سرشار کیا لیکن بقیہ اشعار میں وہ بیباکی نہیں جو غالب کے شعروں کی جان ہے جو پابندِ رسوم و قیود رہتے ہوئے بھی اسے توڑتا رہتا ہے۔ وحشت کے یہاں خوش اخلاقی ہے کجی نہیں جو ان کی غزلوں میں آتی جاتی تصاویر کو مہذب اور مؤدب بنا کر پیش کرتی ہے۔ یہ تصاویر نہ خود عریاں ہوتی ہیں اور نہ ہی معشوق کی دل آزاری پسند کرتی ہیں۔
وحشت کا شعر ہے۔

مری مایوسیوں نے دی مجھے تعلیمِ گستاخی
کہ بیٹھا رہ گزر پر میں اُٹھایا جب مجھے در سے

غالب نے کہا ہے۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

وحشت کا مزید ایک شعر پیش کرتا ہوں پھر گفتگو کروں گا۔

یہ کثرت تھی معاصی کی کہ ہم مایوس ہو جاتے
اگر شرمندگی ہوتی بھی اپنے دامنِ تر سے

غالب کہتا ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

وحشت کچھ یوں فرماتے ہیں۔

خیالِ ماسوا کے ترک سے دل غرقِ لذت ہے
سرورِ ساغرِ لبریز ہے اس جامِ خالی میں

اب غالب کی ہوشمندی ملاحظہ فرمائیں۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

اس نوعیت کے بہت سارے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں بلکہ میں یوں کہوں گا کہ مابعد غالب اس طرح کی بیشتر مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جس میں رنگِ غالب کو اپنانے کی کوشش کی گئی لیکن غالب کا مزاج اس کا اپنا ہے اور ہم اس کی انفرادی صلاحیت کا کسی شاعر سے مقابلہ کر کے بھول کریں گے۔ غالب کی جو شوخیاں اس کے اشعار کو دو آتشہ بنا دیتی ہیں، وہ اس کی اپنی ہیں۔ یہ ایک طرز ہے جس کا استعمال اردو کے دیگر شعرا نے بھی کیا ہے۔ اب کسی کے اچھے شعر سے کسی کے کم تر شعر کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ دو شعر سن لیجیے ایک غالب کا ہے اور ایک ظفر اقبال کا۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منھ سے ذرا بتا کہ یوں

بدن کا سارا لہو کھنچ کے آگیا رُخ پر
وہ ایک بوسہ ہمیں دے کے سرخ رو ہے بہت

غالب بڑا شاعر ہے یقیناً ظفر اقبال سے بڑا شاعر ہے لیکن ظفر اقبال کا شعر غالب کے شعر سے کئی لحاظ سے بہتر ہے جذبات کی عکاسی کے لحاظ سے بھی، قدروں کے لحاظ سے بھی اور معنی آفرینی کے لحاظ سے بھی۔ یہاں ایک تصویری پیکر اُبھرتا ہے جس میں جان ہے لیکن غالب اب

بھی بڑا ہے یہاں بھی بڑا ہے کہ دونوں تصویریں الگ الگ ہیں۔ یہ نقشِ اول ہے لیکن دیرپا ہے یہاں جو شعری محاسن ہیں اور رعایتِ لفظی کا کمال ہے، وہ اس کا اپنا انفراد ہے۔

اس نوعیت کا موازنہ متن کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے لیے تو بہتر ہے لیکن تعینِ قدر کے لیے ناکافی ہے۔ ظاہر ہے شاعری گھوڑ دوڑ تو ہے نہیں جس میں مقابلہ برپا کر کے کوئی قطعی نتیجہ نکالا جا سکے۔ ایسا اس لیے نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ شعر ایک مکمل اکائی ہے۔ وہ ایک مکمل تصویر بناتی ہے جس سے ملتی جلتی تصویر یا تو خراب ہو سکتی ہے یا اس سے بہتر ہو سکتی ہے۔ کوئی چار دہائی قبل شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون 1974 کے کسی شمارے میں ایک مضمون لکھا تھا "صاحب ذوق قاری اور شعر کی سمجھ"۔ فاروقی صاحب نے ہر چند اس مضمون کو نام نہاد صاحب ذوق قاری کا قتل کرنے نیز ان کے درمیان جدید ادب کے لیے جگہ بنانے کے لیے کیا تھا۔ ان کی بہت ساری باتوں سے انحراف کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ میں بھی جو تھوڑا بہت باذوق واقع ہوا ہوں۔ اس میں ان کی تحریر کا بھی دخل ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن ایک صاف نکتہ انھوں نے پیش کر دیا تھا جس کی بازگشت اب ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

> کوئی دو شعر یا دو نظمیں یا دو فن پارے مکمل طور پر مماثل و مشابہ نہیں ہو سکتے۔ کسی فن پارے کا مکمل مماثل وہی فن پارہ ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انسان کا مکمل ہم شکل وہی انسان ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں حتیٰ کی اس کی تصویر بھی نہیں۔
>
> (صاحب ذوق قاری اور شعر کی سمجھ)

اب چراغ سے چراغ جلانے کی بات اور ہے تاہم مظفر حنفی کے مصداق چراغ سے چراغ کو بدلا بھی نہیں جا سکتا۔ اس ضمن میں حالی نے اس نکتے کی طرف ضرور اشارہ کر دیا تھا کہ غالب کی کچھ اپنی شعری خصوصیات ہیں لہٰذا جو کچھ وحشت کے یہاں ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔ دراصل وحشت غالب بننا نہیں چاہتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ یہ بات ممکن نہیں ہے۔ وہ بس جدید غزل کی اس روایت کا حصہ بننا چاہتے تھے جس کے روحِ رواں غالب تھے اور اس طرح وہ اپنے شعروں میں ایسی خوبیاں پیدا کر سکیں جس سے غالب کی یاد تازہ ہو جائے۔

تیرے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت
کہ مقدر ہے ترا غالبِ دوراں ہونا

ظاہر ہے کہ وحشت نے یہ دعویٰ تو کیا نہیں کہ وہ غالبِ دوراں بن گئے ہاں اتنا ضرور کہا ہے کہ سخن کا جو انداز اپنایا ہے، اس کا مقدر غالبِ دوراں ہونا قرینِ قیاس ہے۔ ایسی شاعرانہ تعلیوں سے اردو کی شاعری بھری پڑی ہے۔ وحشت کی قدر دانی ہوئی اور خوب ہوئی۔ ان کے کچھ اشعار بھی ضرب المثل ہو گئے جو آج بھی بہت سارے لوگوں کے حافظے میں موجود ہیں تاہم یہ وہ اشعار ہیں جن میں ندرتِ خیال بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہ اشعار غالب نمائی کا دعویٰ پیش کرنے والے نہیں ہیں۔

یہ دیوانِ وحشت کا پہلا تاثر تھا جو اردو شاعری کی مخصوص اثر انگیزی سے عبارت ہے۔ وحشت ذہین شخص تھے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ جوہر شناس بھی تھے اور زبان پر دسترس بھی تھی۔ مضمون پر لطفِ بیان کو ترجیح دیتے۔ نکتہ پرادزی میں کوئی کمی بھی نہیں تھی۔ اچھے برے اشعار کے ساتھ اردو اور فارسی کی شعریات سے بھرپور واقفیت بھی تھی لہٰذا ان کی شاعری میں بھی وہی گل بوٹے نظر آئے، وہی قدریں در آئیں جو ہماری اردو شاعری کا خاصہ ہے جس سے ہماری شاعری دیگر زبانوں کی شاعری سے ممتاز ہو جاتی ہے۔

افکارِ وحشت

ل احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ ''شعرِ وحشت کا غالب جز و تغزل ہے۔ وارداتِ حسن و عشق دہرائی گئی ہیں مگر یہ سب کچھ تو اردو شعر میں پہلے سے موجود تھا۔ میری نظر میں جو چیز وحشت کو ممتاز بنا دیتی ہے، وہ ان کے فکر و خیال کی ترقی پسندانہ خصوصیت ہے''۔ ظاہر ان کا رخ اس وجہ سے بدل گیا کہ اقبال اصرار کر رہے ہیں۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اور وحشت کا خیال ہے۔

نکل سکا نہ کبھی حلقۂ مجاز سے میں
اگر چہ مجھ کو حقیقت نما مجاز رہا

اقبال شکوہ کرتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

وحشت عرض کرتے ہیں۔

تو کسی کا ہو کے دیکھ اے شکوہ سنجِ روزگار
کیوں یہ کہتا ہے کہ دنیا میں مرا کوئی نہیں

تاہم اقبال کی شاعری کا خاص مرکز ان کی راہِ عمل والی شاعری ہے جس کا ایک زمانہ فریفتہ اور گرفتار رہا ہے اور بیشتر ناقدین نے اسے ترقی پسندیت کی آمد آمد سے تشبیہ دی ہے لیکن وحشت کے بعض ناقدین و شارحین یہ کہتے رہے کہ زمانے کی سرد و گرم کا ان کی شاعری پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بقول وحشت۔

جدت پسندیوں کی طرف رُخ کروں گا کیا
اترا نہیں ہے نشۂ جامِ کہن ابھی

جیسے اشعار کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ حالانکہ یہ مضامین دراصل بازگشت ہیں جو اپنی دل پذیری کے باعث الگ الگ شعرا کے یہاں بار بار آئے ہیں اور آتے رہے ہیں۔ شاعر کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ مضمون کے اور بھی گوشے منور ہو جائیں اور باعلم قاری کے سامنے اسی مضمون سے ملتا جلتا وہ شعر بھی یاد آ جاتا جو قاری کے حافظے میں پہلے سے موجود تھا۔ اس نوع کے اشعار پیش کرنے کی شعوری اور غیر شعوری دونوں ہی کوشش شامل ہو سکتی ہے اور شاعر کا عندیہ شاید یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک قادرالکلام ہے لیکن در پردہ ایک منضبط فکری ماحول پیدا کرنے کے اسباب بھی فراہم ہوتے رہیں بعینہٖ وحشت کے یہاں بھی وہی جدید رویہ نظر آتا ہے جو اقبال کے یہاں تھا۔ اقبال نظم کے کاری گر تھے تو وحشت غزل میں اپنی ہنرمندی دکھا رہے تھے۔ شاید اسی نکتے کی طرف ل احمد اکبرآبادی نے خصوصیت کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ اس نوعیت کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔

وہ کام میرا نہیں جس کا نیک ہو انجام
وہ راہ میری نہیں جو گئی ہو منزل کو

نشانِ زندگی دل ہے بے قراری دل
ہے اس کی موت اگر چین آگیا دل کو

جستجو کے ولولوں کو عافیت سے کام کیا
بار ہا ٹکرا کے پھر پھر ہی گئے ساحل سے ہم

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

محنت پہ ہی موقوف ہے آسائشِ گیتی
کھوئی مری راحت مری راحت طلبی نے

کام جو نکلا ہے زورِ بازوئے فرہاد سے
وہ نکلتا کیا فغاں و نالۂ فریاد سے

مجبور ہے مگر نہیں مایوس دل مرا
بے پال و پر ابھی ہوسِ بال و پر میں ہے

مذکورہ اشعار میں زندگی کی وہی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جو شاعر کو خلوت سے جلوت میں لے آتی ہیں وہ ہم عصر فکری بہاؤ میں شامل نظر آتا ہے۔ حالی نے جس مقصدی شاعری کی پکار بلند کی اس کی بازگشت تو یقیناً سنائی دیتی ہے لیکن منزل منزل چیخنے والے کارواں کا ساتھ وحشت کو منظور نہیں ہاں حرکت و عمل اور پڑاؤ کا ذکر ضرور ہے ان کی نزدیک راہوں کے انتخاب میں اچھے برے نتائج کی پروا بے معنی ہے۔ عافیت کوشی زندگی کو ایک حصار میں قید کر دیتی ہے جہاں فکر

دعمل کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ان کے یہاں ساحل عافیت کوشی کا استعارہ ہے اور موج حرکت دعمل کا لہٰذا جو تصویر بنتی ہے وہ نامکمل ہے جس میں صرف رنگ بھرنا ہی باقی نہیں ہے بلکہ خدو خال کے بدلنے کا احتمال ابھی باقی ہے۔

وحشت کا شاعرانہ مقام

واقعہ یہ کہ وحشت کے اصل جوہر ترانۂ وحشت میں کھلتے ہیں ہر چند وحشت کی شاعری کا ابتدائی رنگ بہت کم عرصے میں اردو غزل کے پارکھوں کی توجہ اپنی جانب منعطف کرنے میں کامیاب رہا۔مہر نیمروز نے وحشت نمبر شائع کیا جس میں کلام وحشت کا انتخاب حسرت موہانی نے کیا تھا۔بنگال میں یہ سعادت وحشت کے بعد کتنوں کو نصیب ہوئی۔ہر چند وحشت براہ راست تنقید کے اُس رویے سے بچتے رہے ہیں جہاں تنقید تلاشِ معائب کی اسیر بن کر رہ جاتی ہے اس کے باوجود ان کی تخلیقی بصیرت کے سبھی قائل تھے۔حالی،شبلی اور اقبال کے فرمودات تو بار بار بیان کیے جا چکے ہیں اور ان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔نیاز فتح پوری جیسی ثقہ شخصیت نے بھی نگار کے خصوصی شمارہ (1946) میں لکھا۔

''ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے لوگوں کا سر جھکتا تھا لیکن ان کے اس رنگ کے سامنے روح دوزانو ہو جاتی ہے''

یہاں یہ نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ اب وحشت کا غالب سے کوئی موازنہ کرنے کی بات نہیں ہے بلکہ اگر موازنہ ہے بھی تو وحشت کا موازنہ وحشت سے ہے۔اس سے یہ نکتہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ وحشت نے غالب کے آئینے میں اپنا عکس تلاش کر لیا تھا تبھی انھوں نے لکھا کہ اگر میرے کلام کو غور سے پڑھا جائے تو کچھ نہ کچھ نیا ضرور ملے گا۔اس کا مطلب یہی ہے کہ وحشت مقلدِ غالب کی حیثیت سے یاد کیے جانے کے مخالف تھے۔بہرنو وحشت کی شاعری کی مقبولیت کا گراف 1910 سے تا دم مرگ برابر اٹھتا ہی رہا۔جیسا کہ سبھی جانتے ہیں دیوانِ اول کی اشاعت کے بعد پورے برصغیر کی مقتدر ادبی شخصیات نے ان کے کلام کی روح کو سمجھا اور ان کے اتباعِ غالب کے طریق کو نہ صرف قبولیت عطا کی بلکہ سند عطا کی۔نیاز فتح پوری نے تو یہاں تک لکھا کہ وحشت نے کلامِ غالب کی اصل خصوصیت معنی آفرینی کو اپنایا۔ملحوظ رہے کہ دیوانِ

وحشت کی اشاعت کے وقت وحشت کی عمر محض 29 سال کی تھی، اس کا مطلب ہے کہ دیوانِ وحشت ان کی کل دس بارہ سال کی محنت کا ثمرہ تھا۔ وحشت اتباعِ غالب میں کامیاب ہوئے یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کی زبان اوائل عمری میں ہی حاصل کر لی اور مشرقی ہند کی اردو غزل بہت حد تک داغ اور امیر کی غزل گوئی سے دور نکل گئی۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ وحشت کی غزل گوئی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں نظم کی صنف نے اپنی جگہ بنانی شروع کی اور بعد کے تیس برسوں میں اردو نظم نے پوری اردو شاعری میں ایک غالب رجحان کی طرح نئی نسل کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ایسے ایام میں جن شعرا نے غزل کی صنف کو سنبھالے رکھا، ان میں حسرت موہانی، یگانہ چنگیزی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی کے ساتھ ساتھ رضا علی وحشت کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ترانۂ وحشت کے یہ اشعار یقیناً اس بات کے مظہر ہیں کہ وحشت نے غالب نوائی کرتے کرتے خود کو دریافت کر لیا تھا۔

ہر چند اپنے سر پہ قیامت گزر گئی
ہم منتظر ابھی تری آوازِ پا کے ہیں

یک قطرۂ خوں بیش نہیں سینے میں یہ دل
اور وہ بھی مرے دیدۂ گریاں کے لیے ہے

کوئی پوچھے سبب گریہ تو کہہ بھی نہ سکوں
آخر اس شغل سے کیا دیدہ تر ہوتا ہے

شرمندہ کیا جوہرِ بالغ نظری نے
اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے

پابندیِ رسوم کو سمجھا ہے بندگی
زنّار چھین لیں گے ابھی برہمن سے ہم

طرزِ جدید میں ہے وہی شیوۂ قدیم
بھرتے ہیں جامِ نو کو شرابِ کہن سے ہم

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیِ چمن کے لیے

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

مزہ آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے تم بیاں کرتے کہیں سے ہم بیاں کرتے

ہماری دور بینی ہے ہمارے امن کی دشمن
نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے

اور زندگی کی حرارتوں سے بھرپور یہ شعر۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

رضا علی وحشت کی شاعری ایسی اقدار کا مرقع ہے جن کی نوعیت دائمی ہیں۔ زمانے کے سرد و گرم اُن پر دھول کی تہہ چڑھاتے رہتے ہیں اور انسانی تہذیب کے ثنا خواں روزانہ اس آئینے سے گرد جھاڑتے رہتے ہیں۔ وحشت ہمارے انھی شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی تہذیب کی ثنا

خوانی کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کے کرب وآلام کو قالبِ شعر میں سمو دیا ہے۔ اس طرح اُن کے کلام میں ایک نوع کی ہمہ گیریت پیدا ہوگئی ہے جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وحشت نے ہجرت کی اور اپنے وطن سے دور ایک نئے ملک میں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام اُسی نئے ملک میں شائع ہوا لیکن سرحدوں کی تقسیم اُن کے کلام کی قدر و قیمت پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ یہی ایک فن کار کی بڑائی ہے اور یہی شاعری اور ادب کی فتح ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرحدوں کی تبدیلی کا اثر موضوعات پر تو ہوتا ہے لیکن مصرعے دولخت نہیں ہوتے۔ ادب نے یہ کام ہر مشکل گھڑی میں انجام دیا ہے۔

آخر میں یہاں میں وہی جملے دہرانا چاہتا ہوں جو علامہ رضا علی وحشت کلکتوی نے ولی دکنی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھے ہیں۔

> ''کیا یہ زیبا ہے کہ ہم اپنے قدیم شعرا جن کی بدولت ہم ایک مہذب اور فصیح زبان بولنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں، بالکل بھول جائیں اور ان کی بیش بہا تصانیف کو ضائع ہونے دیں''۔

وحشت کی حیات و شاعری کا مطالعہ ہمیں اردو فارسی کی مضبوط شعری روایات سے جوڑتا ہے وہ اردو فارسی دونوں ہی زبانوں کی زندہ تہذیبی اقدار کی ثنا خوانی میں تاعمر مصروف رہے۔ وحشت لطفِ زبان کے شاعر تھے ان کے یہاں جو روایتی فکر ہے اس میں ایک نوع کی انفرادیت ہے۔ وحشت کے کلام میں جو صوتی حسن، ترکیبِ لفظی اور معنی آفرینی ہے ان کی غزلوں میں سحر انگیزی پیدا کرتی ہے۔ وحشت کی اپنی زندگی حسرت وآلام سے پر تھی ایسے شعرا بہت ہی کم پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے زندگی کی مسخ صورت سے محبت کی اور بخشی ہوئی حیات کے سارے رنگوں کو اپنی شاعری میں سمو لیا جنھوں نے شاعری کو تہذیبی عبادت کا درجہ دیا، بے بصر آنکھوں کو بصیرت کی مشق کرنے کا موقع دیا، لفظوں کو ایسی قوت گویائی عطا کی جو دل بن کر دھڑکتے رہیں۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وحشت جیسے شعرا کی نسل کی تخلیقی مہارت نے فارسی شاعری کو اردو کا جون بدلنے پر نہ صرف مجبور کر دیا بلکہ اردو شاعری کی اپنی شناخت کو مستحکم کرنے کے دروازے وا کر دیے۔ ایسی

ادبی شخصیات کو ہماری تاریخ ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔ وحشت بھی ایسا ہی ایک نام ہے جس نے غالب کے تخیلی سفر کو دراز کر دیا تا کہ اردو کی نئی ادبی نسل اس ورثے کی توسیع کے قابل ہو سکے۔

وحشت کی نثر نگاری

علامہ رضا علی وحشت کی نثری کاوش کے دو نمونے لائقِ توجہ ہیں۔ ایک ''مضامینِ وحشت'' جو ان کے علمی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جمال احمد صدیقی نے یہ کتاب ترتیب دی اور مغربی بنگال اردو اکادمی نے 1982 میں شائع کی۔ دوسری کتاب مکاتیبِ وحشت ہے جس میں ان کے کچھ منتخب خطوط شامل ہیں۔ اس کتاب کو ان کے جانشین شاکر کلکتوی کی یاد میں قائم شدہ بزم نے 1969 میں شائع کیا۔ وحشت نے اپنے استاد شمس کلکتوی کا کلام امتدادِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے مقدمے کے ساتھ ''دیوانِ شمس'' (1920) کی تالیف بھی کی۔ نتیجتاً وحشت کی نثر نگاری پر جو بھی گفتگو ہوئی ان کی موت کے بعد لیکن ان کے مضامین اردو کے مؤقر جرائد و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مضامینِ وحشت کے مرتب جمال احمد صدیقی رقمطراز ہیں۔

> ''مضامینِ وحشت'' علامہ رضا علی وحشت مرحوم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے 1908 سے لے کر 1954 تک لکھے اور ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ ان مضامین میں کچھ تنقیدی ہیں اور کچھ تحقیقی، کچھ تبصرے ہیں اور کچھ ریڈیائی بات چیت۔ یہ مضامین مخزن، لاہور، خاور،

ڈھاکہ، جدید اردو، کلکتہ، جادو، ڈھاکہ، ماہِ نو، کراچی، مہرِ نیم روز، کراچی میں شائع ہوتے تھے" (مضامینِ وحشت صفحہ 7)

مضامینِ وحشت کے مرتب کو ملال تھا کہ انھیں وحشت کے سارے مضامین حاصل نہیں ہو سکے جس کی وجہ متعلقہ رسائل کی عدم دستیابی ہے تاہم جتنے مضامین دستیاب ہوئے، ان سے 240 صفحات پر مشتمل ایک کتاب منصۂ شہود پر آ گئی۔ وحشت کی نثری عبارت کی خصوصیت سادگی اور روانی میں ہے۔ فارسی اور عربی زبان سے نسبتِ خاص ہونے کے باوجود مروجہ مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی سے ان کی نثر پاک نظر آتی ہے لیکن فارسی زبان کا پُر تکلف اثر غالب ہے۔ اپنے اولین مضمون جس کی سنہ اشاعت 1908 بتائی جاتی ہے، وحشت یوں ابتدا کرتے ہیں۔

"ولی کو موجدِ شعرِ اردو سبھوں نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہے۔ اس سے پہلے بھی کسی کسی نے ریختے میں کلام موزوں کیا ہے مگر اصل بنیاد ولی کی ڈالی ہوئی ہے۔ ہم کو صرف اس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔ اس مضمون میں اس کے حالات سے کچھ بحث نہیں۔ علاوہ بریں اس کے حالات بھی ہمیں واضح طور پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ عالمگیر کے وقت میں اس کو سرسبزی حاصل ہوئی تھی اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں گجرات سے دہلی آیا تھا اور بہت سے لوگ اس کے فیض سے سخنور بنے تھے"

وحشت چھوٹے چھوٹے جملوں سے اپنی بات کا رخ بدلتے ہیں اور جملوں کی ساخت میں اتار چڑھاؤ کے ذریعہ اپنی بات کو پُر اثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"رنگین بیان شعرا گزرے ہیں۔ زورِ کلام سخنوروں نے دکھایا ہے، مضمون آفرینی کے کرشمے دیکھنے میں بہت آئے ہیں مگر وہ سادگی وہ حلاوت جو ولی کے کلام میں موجود ہے سوائے میر کی غزلوں کے ہم کہیں نہیں دیکھتے"

اس بات سے قطع نظر کہ وحشت کے تنقیدی خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن میرا مطمحِ نظر فی الحال وحشت کی طرزِ تحریر ہے۔ وحشت نثر میں بھی شگفتہ بیانی کے قائل ہیں۔ جملوں کی ساخت پر غور کریں تو کہیں کہیں انگریزی نثر کی خصوصیات سے فیضیاب ہونے کی جھلک

صاف دکھائی دیتی ہے۔ وحشت زبان کے ارتقائی عمل سے غافل نہیں۔ زبان کی تشکیل میں جن عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے، دورانِ تحریر ان کے محلِ نظر رہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ولی کی پرانی زبان پر آج کل اردو والے ہنستے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ہماری موجودہ زبان بھی ایک دن پرانی ہو جائے گی اور آئندہ نسلیں ہم پر ہنسیں گی۔ مجھ کو تو بذاتِ خود ان متروک لفظوں میں ایسا مزہ ملتا ہے کہ کیا کہوں۔'' (مضامینِ وحشت صفحہ 23)

وحشت زبان کو تہذیبی ورثے کے طور دیکھتے ہیں۔ اس میں تغیر و تبدل کو اس کا فطری عمل سمجھتے ہیں شاید اسی لیے انھوں نے ولی کی زبان سے متعلق بے حد بلیغ جملہ لکھا۔

''ولی کی زبان کو گو آج کی اردو سے کوئی مناسبت نہیں مگر دلوں کو اس سے بوئے آشنائی آتی ہے'' (مضامینِ وحشت صفحہ 23)

انھوں نے مزید لکھا کہ چاسر اور اسپنسر کی زبان آج کل کی زبان سے بالکل الگ ہے پھر بھی ان میں زندگی محسوس ہوتی ہے، ان کی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور فروخت بھی ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو اشارے کیے اردو زبان کے تعلق سے وہ ناقدری آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اردو کا معاملہ اس زمانے میں بھی اور آج بھی دوسرا ہے۔ اردو میں قدما کی تحریر سے جو بے تعلقی پیدا ہو رہی ہے، اس کی وجہ تہذیبی خلا ہے جو پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

وحشت دراصل لطفِ زبان کے قائل ہیں شاعری میں بھی اور نثر میں بھی۔ ان کے نزدیک ولی کی اہمیت اس بات میں ہے کہ ان کی شاعری کی زبان آج کی زبان سے میل کھاتی ہے یعنی ولی نے جو زبان اختیار کی وہی بعد کے دنوں میں اردو کا لسانی ڈھانچہ قرار پاتا ہے اور آئندہ دنوں میں اسی ڈھانچے پر تعمیرات ہوتی رہیں، رنگ و روغن بدلتے رہے اور اردو کی جدید نثر کی زبان اسی موڑ سے بدل گئی۔ آپ کہیں گے ولی تو شاعر تھا، نہ اس نے افسانے لکھے نہ کہانیاں پھر نثر کی زبان سے اس کا کیا علاقہ تو میں عرض کرتا چلوں کہ زبان کی شکل و صورت پہلے شاعری میں ہی بنتی ہے اور نثر ہر زمانے میں شاعری کی زبان کی چستی اور درستگی سے فیضیاب ہوئی ہے۔ ایسا ہر زبان میں ہوا ہے۔ اردو بھی اس سے یقیناً مستثنیٰ نہیں ہے۔ آمدن بر سرِ مطلب یہاں وحشت کی نثر

نگاری اور ادبی معاملہ فہمی سے متعلق کچھ باتیں یقیناً قابلِ لحاظ ہیں۔

وحشت نقدِ شعر میں شاعر کی ذاتی زندگی کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے

شاعری کی زبان زمانے کے حسبِ مذاق نہ ہو بلکہ اس میں آنے والے زمانے تک دلفریبی قائم رکھنے کی صلاحیت ہو۔

وحشت کو متروکات سے بیر نہیں تھا۔ وہ اسے زبان کے ارتقائی عمل کا حصہ سمجھتے تھے۔

چونکہ وہ زبان کی تہذیبی قدر و قیمت سے غافل نہیں تھے اس لیے قدما کی تخلیق سے بے اعتنائی کو مستحسن نہیں گردانتے۔

پرانی زبان میں بھی نازک مضامین پیش کیے جا سکتے ہیں۔

زبان، لطفِ بیان اور بندش کے ساتھ تشبیہ کی خوبی سے شعر بہتر ہو سکتا ہے، لفظ بھی مضمون ہو سکتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ جو جوہر ہے وہی عرض ہے لہٰذا جو لفظ ہے وہی شعر ہے۔

یہ نکتہ دراصل نفسِ شعر میں اس کلیدی لفظ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے گرد شعر کا معنیاتی نظام گردش کرتا ہے۔ ہمارے قدما نے بھی شعر گری میں لفظ کے ناگزیر استعمال پر زور دیا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو حشو، حشو زائد کی ترکیب سننے میں نہیں ملتی۔ میر کے شعر کا ذکر کرتے ہوئے وحشت نے تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ایک ''بھاگو ہو'' (کی شعریت) پر ہزار بھاگتے ہو قربان۔ اس کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ فصیح اور غیر فصیح کے معنی حسنِ استعمال سے بدل سکتے ہیں۔ میر کے درج ذیل شعر سے آپ بھی واقف ہیں جسے وحشت نے زیرِ تذکرہ مضمون میں نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

وحشت نے ولی کے اشعار کی مزید ایک توصیف بیان کی کہ وہ نازک مضمون اپنی پرانی زبان میں پیش کرنے کے ہنر سے واقف تھا اور دعویٰ کیا کہ عرفی و نظیری اس سے بہتر شعر نہیں کہہ سکتے۔ شعر دیکھیے۔

اگر جاوے پیا کی کھ طرف بخت آزمائی کو
کرے معشوق کا تغافل اُٹھ کے استقبال عاشق کا

اس بات سے قطع نظر کہ ولی دوسرے مصرعے کی قرأت عروضی تسامح (یعنی مصرعے کا خارج از بحر ہونے) کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وحشت معشوق کے تغافل کا اٹھ کے عاشق کا استقبال کرنے کو حسنِ بیان قرار دیتے ہیں کہ کس طرح تغافل کے استقبال سے نفی کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ وحشت امورِ شاعری میں معنی کی پیشکش میں طرزِ بیان کی مشاقی کو اچھا شعر خلق کرنے کا ذریعہ سمجھے ہیں۔ اس کے ساتھ وحشت اس بات کے بھی قائل ہیں کہ قدما کی اسی زبان کے سہارے "ہم ایک مہذب اور فصیح زبان کے بولنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں"

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مذکورہ مضمون کی اشاعت 1908 میں ہوئی جبکہ وحشت کا دیوان 1910 میں شائع ہوا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ شاعری اور شاعر کی فی زمانہ تنقید پر وحشت کی نظر شروع سے ہی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ترجیح شاعری ہونے کے باعث نثر نگاری ان کے معمولات میں شامل نہیں تھی۔ گاہے گاہے لکھے گئے یہ مضامین بھی جب ایک ساتھ منظرِ عام پر آئے تو ان کی شخصیت کا ایک اور گوشہ منور ہو گیا۔

فارسی شاعر علی حزیں پر مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس مضمون میں وحشت نے تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ماخذ کے طور پر بیلس کی آرینٹل بائیوگرافی (اصل نام An oriental Biography Dictionary by Thomas Willam Bells. 1894) سے حزیں سے متعلق حقائق کی شہادت پیش کی ہے۔ تھامس ولیم بیلس بورڈ آف ریونیو میں کلرک تھا۔ اس کتاب کے اشاعت کی ذمہ داری ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کو دی گئی تھی جس میں ایشیا کی مشہور و معروف کی برگزیدہ مسلم شخصیات کے نام اردو رسم الخط میں اور انگریزی میں مختصر سوانح پیش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے وحشت نے اپنے مطالعہ کو محدود نہیں رکھا تھا بلکہ وہ دیگر زبانوں سے بھی کسبِ فیض کرتے رہے ہیں۔ شاید ان کی سوچ یہ رہی ہوگی کہ مشرقی تہذیب کو مغرب کے فن کار کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیلس نے کبھی لندن کا منہ نہیں دیکھا اور اس کا انتقال آگرہ میں ہوا لیکن جو شخصی لغت اس نے ترتیب دی، اس کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔

حزیں کے کلام کا انتخاب پیش کرتے ہوئے وحشت نے عجب رنگ اختیار کیا۔ انھوں نے حزیں کے اشعار کا فارسی اور اردو کے بڑے شعرا کے ساتھ تقابل پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حزیں کو بڑے شعرا کے مقابل کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے نیز مختلف بڑے شعرا کے یہاں فکر و خیال کی کس قدر ہم آہنگی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے حزیں کے تقابل میں جو اشعار پیش کیے ہیں، وہ لطف سے خالی نہیں ؎

چشمِ رقیب گفتمش محرم روی خود مکن
کرد بکار دیدہ ام مصلحتِ شنیدہ را

(حزیں)

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(غالب)

افسردہ شد جہاں چوں حزیں از میانہ رفت
مجنوں گزشت شور و بیاباں فروگزشت

(حزیں)

ہراک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

(غالب)

مدتے شد کہ زدشت آبلہ پائی نگرشت
جگر از تشنگی خارِ بیابانم سوخت

(حزیں)

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آئے

(غالب)

وحشت نے لکھا ہے کہ غالب نے حزیں کے شعر کو نہ صرف معنوی وسعت دی ہے کہیں کہیں لطفِ بیان میں حزیں سے آگے نکل گئے ہیں۔اس سے یہ نکتہ صاف ہو جاتا ہے کہ اردو کی وسعتِ دامانی میں فارسی ادبیات سے کسبِ فیض کو قدما نے غیر مستحسن نہیں سمجھا ہے۔

وحشت تفصیل پر اجمال کو ترجیح دیتے ہیں۔صاحب حدائق البلاغت منشی شمس الدین فقیر کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے۔

> ''یہ شعر ظہوری کا حزیں کے شعر سے بہتر ہے کیونکہ حزیں نے جس مضمون کے ادا کرنے میں اتنے الفاظ صرف کیے ہیں، ظہوری نے اسی مضمون کو مختصر لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور لفظ ناتواں کا استعمال صید کی نسبت کر کے ایک بات پیدا کر دی ہے جو حزیں کے شعر میں نہیں ہے۔ حزیں کہتا ہے کہ کہ اس صید پر میرا دل جلتا ہے کہ جو دام میں رہ گیا ہو اور صیاد اسے بھول گیا ہو۔مضمون تو درد خیز ہے لیکن صید کی نسبت اگر ناتواں کا بھی ذکر ہوتا تو اس کی بے کسی زیادہ قابلِ رحم ہوتی کیونکہ اس حال میں دام سے نکلنا بالکل ناممکن تھا''

(مضامین وحشت صفحہ 68)

اب دونوں اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

اے وائے برا سیرے کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

(حزیں)

براں ناتواں صید بیداد رفت
کہ در دام از یاد صیاد رفت

(ظہوری)

مولانا نے اس نکتے کی طرف توجہ دلائی کہ ظہوری نے اس مضمون کو حزیں سے پہلے ادا کیا ہے لہٰذا یہ نکتہ بھی نکلتا ہے کہ نقشِ ثانی اسی صورت میں بہتر ہو سکتا ہے اگر وہ نقشِ اول سے بہتر

صورت پیش کرے۔

وحشت دراصل غزل کے بے غرض پرستار تھے۔ آج بھی اردو کا معمولی سے معمولی شاعر صنف غزل ہی کا دامن تھامے ایوانِ شاعری میں داخل ہوتا ہے۔ وحشت کے سامنے جو تخلیقی نمونے دستیاب تھے، ان میں سب سے معروف اور مقبول صنف غزل ہی تھی۔ وہ غزل کے عمدہ پارکھ بھی تھے اور دمساز بھی۔ جب غزل پر چوطرفہ حملہ ہو رہا تھا اور اظہارِ بیان کے لیے اس صنف کو ناکافی سمجھا جا رہا تھا، وہ اپنے مضمون ''تغزل میں اصلاح کی ضرورت'' میں غزل کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''میں حیران ہوں کہ غزل میں اگر فطری جذبات ادا کیے جائیں تو نیچرل کیوں نہ کہلائے۔ کیا نیچرل شاعری کے یہی معنی ہیں کہ درخت اور پہاڑوں کی مصنوعی اور مقلدانہ تعریف کی جائے۔ شاعری نیچرل وہی ہے جس کی بنیاد حقیقت پر ہو۔ سعدی و حافظ، نظیری و عرفی، میر و غالب کے کلام میں سینکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو بالکل نیچر کی تصویر ہیں اور زبان زدِ خلائق ہیں''۔

یہاں بعض ذہنوں میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ وحشت غزل کی روایتی معنویت کے اسیر نظر آتے ہیں اور اپنی غزل پرستی کے باعث اس کی تنگ دامانی کا شکوہ نہیں کرتے تو کوئی عجب نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے فارسی اور اردو کی غزلیہ شاعری کی صدیوں پر محیط روایت ہے اور کوئی نوخیز صنف (نظم) کو اس کے نعم البدل کے طور پر پیش کرنا آسان نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وحشت صرف غزل کے ہی نہیں بلکہ اپنی ثقافتی قدروں کے نبض شناس تھے۔ اپنے اسی مضمون میں وحشت مزید رقمطراز ہوتے ہیں۔

> ''غزل ایک زینہ ہے جسے طے کیے بغیر اور کسی قسم کی نظم میں دستگاہ پیدا کرنا دشوار ہے بلکہ محال ہے۔ برسوں کی غزل گوئی کے بعد مولانا حالی اپنا مسدس لکھ سکے۔ حضرت اقبال بھی متعدد غزلیں لکھ چکے ہیں اور لسان العصر اکبر نے بھی قدیم رنگ میں بہت سی غزلیں کہی ہیں''

مولانا غزل میں بھی نئے اور پرانے اسلوب کے فرق کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ انھوں

نے اکبرالہ آبادی کی قدیم رنگ کی غزلوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ وہ حالی واقبال کی غزلوں کو حسب حال سمجھتے تھے۔ انھوں نے غزل میں پیدا شدہ خرابیوں اور میکانیکی طور پر شعر گڑھنے کے عام رجحان کو کبھی پسند نہیں کیا۔ غزل کے پارکھ کی حیثیت سے ان کے نزدیک یہ سب خرابیاں سامنے کی چیز تھیں۔ غزل کو ہمہ گیر بنانے کے لیے انھوں نے چند نکات پیش کیے ہیں۔ اگر ان پر عمل ہو تو لوگ نیچرل نظموں کو بھول جائیں گے۔

غزلوں میں اشعار کم ہوں
پامال زمینوں پر خامہ فرسائی نہ کی جائے
اس بات کا ہمیں اختیار نہیں کہ اوروں کی زمین پر قبضہ کر لیں
زمیں کے انتخاب میں بھی حسنِ طبع کی ضرورت ہے
جدتِ مضامین اور شستگیِ الفاظ کا خیال رکھنا چاہیے
پیش پا افتادہ خیالات کے نظم کرنے سے پرہیز کیا جائے
مقلدانہ طور پر تشبیہات سے احتراز کرنا چاہیے
عاشقانہ مضامین کو غزل کا ایک جزو سمجھیں مگر جزو اعظم نہ سمجھیں
تہذیب سوز اشارات و کنایات سے یک قلم کلام کو پاک رکھیں
ہر شعر کا ایک مدعا ہونا چاہیے
ایک مکمل مضمون ہونا چاہیے
زندگی کا کوئی مسئلہ ہونا چاہیے
حسن و عشق کا کوئی نکتہ ہونا چاہیے
ساتھ ہی ساتھ اسلوب بیان تو شاعرانہ ہونا ہی چاہیے

محولہ بالا خیالات پر غور کریں تو کئی چیزیں سامنے آئیں گی۔ انھوں نے کہا کہ ہر شعر کا ایک مدعا ہونا چاہیے نیز زندگی کا مسئلہ ہو یہی باتیں تو ترقی پسند شعرا بھی کہہ رہے تھے۔ اس کے ساتھ انھوں نے یہ شرط رکھی کہ اسلوب بیان شاعرانہ ہو۔ یہ کلیہ تو آج کے شعرا کے لیے بھی لائق عمل ہے۔

وحشت نے زیادہ تر مضامین بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھے سوائے شمس کلکتوی پر مضمون جو انھوں نے 1920 میں لکھے۔ تقریباً تین دہائیوں تک یا وہ خاموش رہے یا پھر مرتب کے لیے ان کے مضامین تک رسائی ممکن نہیں ہوئی۔ وجہ جو بھی ہو بنگال کی اردو نثر کو ان سے جو فیض پہنچنا تھا، وہ حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تقسیم کے بعد موضوعات اور منظر نامہ دونوں ہی بدل گئے۔ ادب سے زیادہ زبان کا تحفظ سب سے اہم مسئلہ ثابت ہوا۔ وحشت نے اپنے ڈھاکہ ریڈیو کے لیے ایک نشریہ پیش کیا جس میں اردو کے تئیں بنگالی ہندوؤں کی خدمات کو اجاگر کیا اور اردو والوں کی اس زبان سے دوری پر انھیں دوبارہ قریب لانے کے لیے اس کی شاندار تاریخ، گنگا جمنی خصوصیت اور یکجہتی و ہم آہنگی کی فضا کے ساتھ ایک سے ایک بڑی شخصیات کا ذکر کیا جنھوں نے اس زبان پر ایسی دسترس حاصل کی جس کی وجہ سے وہ زندہ و جاوید ہو گئے۔ مشہور بنگلہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ان کے والد فارسی زبان پر خاصی قدرت رکھتے تھے۔ خود ٹیگور کی شاعری پر حافظ کے اثرات کا ذکر بہتوں نے کیا ہے۔ بنگلہ شاعر قاضی نذرالاسلام کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کلکتہ کے ٹالی گنج اسٹوڈیو کا ایک واقعہ بیان کیا جو سننے کی چیز ہے۔

> ''مجھے جناب نذرالاسلام کی ملاقات کا شرف کلکتے میں حاصل ہوا تھا۔ کوئی آٹھ نو سال کا ذکر ہے ایک فلم کمپنی جس کا اسٹوڈیو ٹالی گنج میں تھا۔ ارادہ کیا کہ ایک فلم بنائیں جس میں عالم ارواح سے ایک مشاعرہ دکھایا جائے شعرا میں جہاں تک مجھے یاد ہے مشاعرہ میں شرکت کرنے والے میر، غالب، مومن اور داغ قرار پائے اور ایسا انتظام ہوا کہ میر کا پارٹ نذرالاسلام صاحب کو دیا جائے۔ غالب کا اس حقیر کو، مومن کا ساغر نظامی کو اور داغ کا جگر مرادآبادی کو۔ غرض ہم سب اسٹوڈیو میں آموجود ہوئے اور میک اپ کے مراحل طے کیے گئے۔ شاعر نذرالاسلام کی شخصیت کو میں نے بہت جاذب پایا۔ میرا خیال تھا اردو میں مکالمہ اور میر کے اشعار کا پُر اثر طریقے سے پڑھنا نذرالاسلام کے لیے

مشکل ہوگا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ان کو اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ میر کے اشعار جذبات کی تصویریں ہیں۔ ان کی اداکاری کے لیے نذرالاسلام ہی جیسا شخص چاہیے جس کو قدرت نے بلا کا حساس دل دیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا اردو آپ نے کب سیکھی۔ انھوں نے ایسا جواب دیا کہ میں شرمندہ ہوگیا۔ کہا کہ ''میرا ہم وطن وحشت اردو کا مشہور شاعر ہے۔ اس کا کلام پڑھنے کے لیے میں نے اردو سیکھی۔ اپنی بے بضاعتی پر مجھے خاص طور پر خجالت ہوئی کہ میں یہ نہیں کہہ سکا کہ میں نے آپ کا کلام پڑھنے کو بنگلہ سیکھی ہے''

(مضامین وحشت، صفحہ 230)

مکاتیب وحشت

اردو کی ادبی روایت کی توسیع میں ارباب فن کے مکتوبات نے صرف اس وجہ سے ہی اہمیت حاصل نہیں کی ہے کہ ان شخصیات کی زندگی کے بعض ناآشنا گوشے ان کی مکتوب نگاری کی وجہ سے منور ہو جاتے ہیں بلکہ ایک ان کی دستاویزی حیثیت مسلم ہوگئی ہے کہ بعض اہم ادبی نکات سے پردہ کشائی میں ان خطوط کی رہنمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کے خطوط تو ان کے عہد کا مرقع پیش کرنے کے ساتھ ساتھ صاف اور شستہ نثر کے نمونے کے طور پر اہل ادب کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ کلکتہ میں جس اردو نثر کی داغ بیل فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ پڑی، اس میں ہمارے اپنے فن کاروں نے بھی غیر شعوری طور پر اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ خطوط غالب کی ان معنوں میں اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بعینہ غالب کی پیروی ہو نہ ہو مکتوب نگاری، ابلاغ و ترسیل کا واحد ذریعہ رہی ہے جس نے ہرکارے سے لے کر ڈاک و تار کے ذریعہ اہم خدمات انجام دی ہیں۔ راجاؤں، شاہوں اور نوابوں سے جدید طرز حکومت میں اس نے ایک نظام کی صورت اختیار کر لی ہے لیکن فن کار جس کسی وسیلۂ علم کو ہاتھ میں لیتا ہے تو اسے وہ دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ تاریخ ان مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ وحشت نے غالب کی پیروی میں شاعری کی اور مکتوب بھی لکھے لیکن نہ ہی غالب کو اور نہ ہی وحشت کو یہ خیال آیا ہوگا کہ ان کے خطوط شائع بھی کیے جائیں گے اور اردو

کی ادبی روایت میں اس کی قدر و منزلت تسلیم کی جائے گی۔

کوئی نصف صدی پیشتر مکاتیب وحشت کی اشاعت ہوئی۔ مکاتیب وحشت ان کی ذاتی زندگی کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اس موضوع پر نہایت عالمانہ مضمون لکھا ہے جو رسالہ مغربی بنگال کے وحشت نمبر میں شائع ہوا ہے۔ وحشت پابندی کے ساتھ احباب اور شاگردوں کے خطوط کا جواب دیتے۔ خط لکھنے کے لیے پورا اہتمام کرتے۔ ان کے زیادہ تر خطوط ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن ادبی شان اور ان کی شاعرانہ طبیعت کے جلوے جا بجا کارفرما نظر آتے ہیں۔ اپنی زندگی کے نامساعد حالات، کلفتوں اور بیٹے کی ذہنی بیماری کے ذکر کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی محبت، یہاں کی زندہ دل ادبی فضا، شاگردان کی غزلوں پر اصلاح، ادبی گفتگو، کتابوں پر تبصرے جیسے معاملات بھی ان کے خطوط کا موضوع ہیں۔ تاخیر ہوتی تو شکایت رفع کرنے کی کوشش کرتے اور خط لکھ کر احباب کی دوری کا غم غلط کرتے۔ وحشت کے مکاتیب میں والہانہ پن اور وارفتگی ہے۔ خلوص اور محبت ان کی شخصیت کا جوہر ہے جس کا عکس ان کے مکتوبات میں جا بجا نظر آتا ہے۔ غالب نوائی تو کی لیکن خطوط میں سنجیدگی اور متانت کو مقدم رکھا۔ شاعری میں جس محزونی کا ذکر جا بجا ملتا ہے، ان کے خطوط بھی انھیں صفات کا مرقع ہیں۔ مظفر حنفی رقمطراز ہیں۔

> ''وحشت کے فن پر غالب کے اثر کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے اور خود وحشت نے بھی کئی مقامات پر غالب سے اثرات قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ غالب نے طرز بیدل میں ریختہ کہنے کو قیامت سے تعبیر کیا ہے، میں سمجھتا ہوں طرز غالب میں ریختہ کہنا اس سے بڑی قیامت تھی جس سے علامہ وحشت کامیابی کے ساتھ گزر گئے لیکن مکاتیب وحشت کا مطالعہ اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ وحشت نے اپنے خطوط پر غالب کی مکتوب نگاری کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دی۔ غالب کی طرح انھوں نے نہ تو آداب والقاب میں کوئی ندرت برتی نہ مکالماتی اسلوب سے کام لیا اور نہ ہی ظریفانہ انداز بیان اختیار کر کے اپنے خطوط کو شگفتہ بنانے کی کوشش کی''

وحشت مکتوب نگاری میں بھلے غالب سے پیچھے رہ گئے ہوں لیکن انھوں نے مکتوب نگاری میں کسی نوع کی آرائش سے کام نہیں لیا لیکن برمحل اشعار ضرور پیش کیے، کبھی اپنے اور کبھی مشاہیر کے۔ القاب میں تعظیم و تکریم کا انداز۔ دائیں طرف مقام و تاریخ، درمیان میں القاب اور پھر خط کا اصل متن۔ ڈھاکہ سے عندلیب شادانی کو خط لکھتے ہیں۔

عظیم پورہ کالونی

یکم جنوری 1952

کرم فرمائے عالم تسلیم

نشاطِ رفتہ پر میں نے کچھ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ اس کام کو جیسا چاہیے انجام نہیں دے سکا ہوں۔ ضعفِ پیری نے نکما کر دیا ہے

''خاور'' کا جنوری نمبر خاص طور پر مجھے پسند آیا۔ قاضی عبدالودود اور اثر لکھنوی کے مضامین نے میری معلومات میں مفید اضافہ کیا۔ حصۂ نظم میں مغیث الدین فریدی (جن کا نام میں نے اس سے پہلے نہیں سُنا تھا) کی غزل میری نظر سے گزری اور میرے اس خیال کی تصدیق و تائید ہوئی کہ اچھے شعر عموماً غیر معروف شعرا سے سننے میں آتے ہیں۔ فروری خاور کے لیے ایک تازہ اور غیر مطبوعہ غزل پیش کرتا ہوں۔

نیازکیش

وحشت

1957

جیسا کہ مذکورہ خط سے ظاہر ہے، وحشت براہ راست مطلب کی بات کرتے ہیں اور دوٹوک انداز میں اپنی رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ مکاتیب وحشت کے مؤلف نے مکاتیب وحشت میں 182 معلوم خطوط شامل کیے ہیں جن میں اکثریت ان حضرات کی ہے جن سے یہ خطوط حاصل کیے جا سکے ہیں۔ ان کے زیادہ تر خطوط ان کی رنجور طبیعت کا پتہ دیتی ہے۔ اپنے

ایک خط بنام ظفر ہاشمی میں لکھتے ہیں۔

''شعر و شاعری سے مدت ہوئی دل بیزار ہے۔ عہدِ شباب
میں شوق تھا اور شباب کے ساتھ ہی شوق جاتا رہا۔
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
آپ نے ایک ایسے شخص کو اپنا استاد بنایا جس کا دلِ افسردہ
آپ کے جوشِ طبیعت کی قدر کافی طور پر نہیں کر سکتا''

(مکاتیبِ وحشت، ص72)

وحشت کے خطوط کی اشاعت کا کام ان کی حیات کے آخری عشرے میں ہی شروع ہوا تھا لیکن وہ برابر اس کے لیے انکار کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے خطوط اس لائق نہیں ہیں کہ شائع کیے جائیں اور وہ خود بھی خطوط محفوظ نہیں رکھتے لیکن بزمِ شاکری کے اراکین کی مسلسل پیروی کے سبب وحشت کو تسلیم کر لینا پڑا کہ ان کے خطوط کی اشاعت کی جائے۔ علامہ وحشت نے 1950 میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ڈھاکہ ہجرت کی۔ بعد کے خطوط میں وحشت نے زیادہ تر اپنے ان جذبات کا اظہار کیا ہے جو کلکتہ سے ان کی گہری وابستگی کی گواہی دیتے ہیں۔ اپنے شاگرد پروفیسر عباس علی خان بیخود جنھیں وہ بطورِ خاص عزیز رکھتے تھے، لکھا۔

''ملنے والے یہاں متعدد ہیں لیکن وہ خلوص جو مجھے کلکتہ کے
محبانِ عزیز میں ملتا تھا، اس کا یہاں فقدان ہے۔ تکلف کی ملاقاتیں دل کو
راحت نہیں پہنچاتیں۔ کلکتہ کی بات کلکتہ کے ساتھ گئی''

(مکاتیبِ وحشت، صفحہ 12)

استادی اور شاگردی کی روایت اور وحشت:

اُردو میں استادی اور شاگردی کی جو روایت رہی ہے، وہ بہت قدیم ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سے بہت سارے لوگ واقف ہیں۔ میر، سودا، مصحفی، غالب، ذوق، آتش، داغ، امیر اور پھر بنگال میں عبدالغفور نساخ، ابوالقاسم شمس کلکتوی، رضا علی وحشت، آرزو لکھنوی۔ ناطق لکھنوی کا حلقۂ

تلامذہ بہت وسیع تھا۔ ان کے بعد شاکر کلکتوی، پروفیسر عباس علی خان بیخود، پرویز شاہدی، جرم محمد آبادی، خواص قریشی، ابر احسنی گنوری، ابوالبیان مائل لکھنوی، نواب دہلوی اور سید علی ظفر شمیم وغیرہ کے کارنامے بحیثیت استاد شاعر یقیناً یاد رکھے جائیں گے۔ میں نے یہاں صرف چند نام ہی لیے ہیں۔ ایسے اساتذہ، اور ان کے حلقۂ تلامذہ کی تعداد ان تمام اردو خطوں کے برابر ہے جہاں جہاں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ کسی کسی نو آباد اردو جزیرے میں کئی کئی اہلِ زبان شعرا موجود رہے ہیں۔ ان ہی استاد شعرا کے طفیل اردو میں دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کی بحث سے بھی ہم یقیناً واقف ہوں گے۔ اس ضمن میں اساتذہ حضرات کے مابین معاصرانہ چشمک اور اس کے نتیجے میں زبان اور شاعری کے کھلتے رموز و نکات بھی ہمارے سامنے ہیں۔ غالب اور کلکتہ نیز مرزا قتیل کے حوالے سے غالب کی زبان دانی پر سوال کھڑے کرنا یا پھر ذوق اور غالب کے درمیان معاصرانہ چشمک دراصل وہ روشن حوالے ہیں جنھوں نے استاد اور شاگرد دونوں میں تقابل اور برتری کی جنگ کے ذریعہ اعلیٰ معیار پر پہنچنے کی راہ ہموار کی تاہم بعض اہلِ علم کو اس روایت میں فیض رسانی کے حوالے کم کم نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سالک لکھنوی صاحب کا حالیہ دنوں میں مضامین کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اور جس کا نام بھی "مضامین" ہے، سالک صاحب اس روایت کو بہت حد تک مستحسن نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک شاگردوں کے کلام کی اصلاح کرتے کرتے اساتذہ انھیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے شاعر کی انفرادیت کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک اچھا استاد شاگرد کے مزاج کے اعتبار سے اُس کی تربیت کرتا ہے تاکہ اُس کا تخلیقی جوہر اُس کی انفرادیت کے ساتھ ظاہر ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ایک ہی شاعر کے تمام شاگرد ان ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے۔ یہاں مثالیں پیش کرنے کا محل نہیں ہے۔ پھر بھی اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ اگر ہم صرف شاگردانِ وحشت کے ہی کلام کا جائزہ لیں تو ان کی شاعری میں فرق نظر آئے گا۔ ایسا واضح فرق جو ہمیں جمیل مظہری، عباس علی خاں بیخود اور شاکر کلکتوی کے کلام میں نظر آتا ہے۔ بذاتِ خود وحشت کے استاد ابوالقاسم شمس داغ دہلوی کے شاگرد تھے لہٰذا یہ ممکن تھا کہ وحشت کی ابتدائی غزلوں پر داغ کی اثر پذیری کے نشانات نظر آتے لیکن انھوں نے غالب کا رنگ اختیار کیا اور اپنے وقت کے تقریباً تمام اکابرینِ فن سے اپنے مشقِ سخن کی داد حاصل کی۔ یہ ہے انفرادی فطانت کا اصل جوہر جو جادۂ منزل کی تلاش میں معاونت کرتا

ہے۔اعزاز افضل اپنے مضمون ''سید رضا علی وحشت'' میں لکھتے ہیں۔

''شاگردان کے اشعار کی اصلاح تو سب کرتے ہیں لیکن شاگردوں کے ذہن کی اصلاح کرنا کچھ وحشت کا ہی کام تھا۔ان کے فیضِ تربیت نے اردو کو کئی ممتاز شاعر دیے ہیں''

(خدوخال۔10)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ علامہ رضا علی وحشت زبان اور شاعری کے رمز شناس تھے بلکہ میں یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ کسی بھی فنکار کی بڑائی میں صرف اس کی شخصیت اور انفرادی تخلیقی صلاحیت کا ہی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ شعری مزاج و ماحول کی کارفرمائی تخلیق کار کی طبع رواں کو اور بھی تیز رفتار بنا دیتی ہے۔مثال کے طور پر غالب کی بڑائی اس نکتے میں بھی مضمر ہے کہ اُس کے زیادہ تر معاصرین کو نابغۂ روزگار کی حیثیت حاصل تھی۔علامہ رضا علی وحشت کے زمانے میں بھی آرزو لکھنوی اور ناطق لکھنوی جیسے استاد اور مسلم الثبوت شعرا موجود تھے۔ان کے کلام کا رنگ بھی جدا جدا اور منفرد ہے۔ناطق لکھنوی کے یہاں لکھنوی آداب کی شان اور جلوہ گری نظروں کو خیرہ کرتی ہے تو آرزو لکھنوی نے خالص ہندوستانی طرز و آداب اور نیم فارسی زبان کو اپنی ترسیل کا ذریعہ بنایا جب کہ علامہ رضا علی وحشت نے پیروی غالب میں پُر تاثیر زبان اور فکر انگیز لہجے کو اپنا شعار بنایا۔ غور کریں تو اردو شاعری میں مروج غالب شعری رویہ اور اس کے ساتھ ساتھ آرزو لکھنوی کی سریلی بانسری سے معمور بنگال کی ادبی فضا پورے برصغیر کو اپنے آہنگ سے متاثر کر رہی تھی۔اس دعویٰ کے حق میں یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ شوق قدوائی جب اپنی غزلیں اردو کے نامور استاذ شعرا کے پاس بغرضِ اصلاح ارسال کر رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی غزلیں آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی اور وحشت کلکتوی کے حضور میں بھی بغرضِ اصلاح پیش کیں۔شوق قدوائی نے لکھا ہے کہ اصلاح کا یہ سلسلہ 1917 سے 1923 تک جاری رہا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دیوانِ وحشت کی اشاعت کے محض چھ سات برسوں میں ہی مولانا کی شخصیت بحیثیت استاد شاعر اعتبار حاصل کر چکی تھی۔شوق نے اپنی کتاب کا نام اصلاحِ سخن رکھا اور 1926 میں اس کی اشاعت کی۔اتر پردیش اردو اکادمی نے 1982 میں اس کی دوبارہ اشاعت کی ہے اور یہ کتاب

عام طور پر دستیاب ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی وحشت کو بعض مقامات پر فضیلت حاصل رہی اور اُن کی سنواری ہوئی غزلوں کے طریقۂ اصلاح کو اہلِ نظر نے پسند کیا۔ وحشت نے بیخود دہلوی، نوح ناروی اور نیاز فتح پوری کی طرح بعض مقامات پر وجہِ اصلاح بھی تحریر کی ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ ایک مقام پر میدانِ محشر کی ترکیب بحث کا موضوع بن گئی ہر چند وحشت نے اپنی پہلی ترمیم میں میدانِ محشر کی ترکیب کو شعر میں روا رکھا تاہم بیخود دہلوی کے اعتراض پر جب شوق قدوائی نے اُن سے دوبارہ رجوع کیا تو انھوں نے اپنے ایک خط میں اس نکتے کو صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

> ''میدانِ محشر میں جو آپ کو شک ہے وہ بجا ہے۔ کیونکہ محشر اسمِ ظرف ہے یعنی وہ جگہ جہاں حشر ہو۔ میدان کا لفظ زیادہ ہے۔ میدانِ حشر۔ عرصۂ حشر صحیح ہیں۔ وحشت''

ضمیمہ اصلاحِ سخن، صفحہ 217

تاہم وحشت اپنے ایک خط بنام عبدالعلی سندیلوی میں عرصۂ حشر کی ترکیب سے احتراز کرنے کے لیے کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''عرصۂ محشر اگرچہ مروج ہے اور خود میرے دیوان میں ہے لیکن قابلِ تقلید نہیں۔ شعرا نے بہت سی باتوں کو جو قابلِ تسلیم نہیں رواج دے دیا ہے''
>
> (مکاتیب وحشت، صفحہ 72)

کتاب میں شامل شوق کی پہلی غزل کا دوسرا شعر کچھ زیادہ ہی موضوعِ بحث بنا جہاں نوح ناروی نے قافیے کے انتخاب کے لیے یہ شرط روا رکھی کہ اگر کسی غزل میں قوافی میں اردو اور فارسی کے الفاظ شامل ہوں تو ''مطلع میں یہ التزام رکھنا چاہیے کہ ایک قافیہ اردو کا ہو اور ایک فارسی کا ہو جب مطلع میں دونوں قافیے فارسی ہوں تو غزل میں پھر اُردو قافیے نہ لانے چاہئیں اور چونکہ شوق نے اپنی غزلوں میں اس طریق کو رائج رکھا لہٰذا اس بات پر نوح ناروی نے شوق قدوائی کی تحسین کی لیکن ان کی نظر اس عیب پر نہیں گئی جس پر وحشت کی نظر گئی۔ وحشت نے مطلع کو ہی دو

لخت قرار دیا۔ دیگر اساتذہ نے شعر میں یوں ترمیم کی کہ پورے کا پورا مصرعۂ اول بدل دیا تو کسی نے ثانی مصرع میں ترمیم کی لیکن وحشت نے نہ صرف دونوں مصرعوں پر الگ الگ مصرعے جڑ دیے بلکہ اس کی صراحت بھی فرمائی۔ شعر یہ تھا۔

آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہوجانا
یوں ترے عشق میں انگشت نما ہوجانا

علامہ نے یوں دلیل پیش کی۔

مصرعۂ اول ایک اور مطلب کا تقاضہ کرتا ہے۔ "آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہوجانا" یعنی وہ بات ہوئی جو ہونے والی تھی اگر چہ اُس کی خواہش نہ تھی، کسی کے عشق میں انگشت نما ہوجانا، یہ عاشق کے لیے کوئی بری بات نہیں ہے۔ یہ تو اُس کے لیے باعثِ فخر تھا۔ پھر آج کا لفظ تشریح طلب تھا۔ میں نے دونوں مصرعوں پر الگ الگ مصرعے لگا دیے ہیں۔ وحشت

آخر اس بت کے تغافل نے کیا کام تمام
آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا
تیری تائید بھی تھی ورنہ کہاں ممکن تھا
یوں ترے عشق میں انگشت نما ہوجانا

ہر چند اس مطلع میں آرزو لکھنوی کی ترمیم بیحد پسند کی گئی لیکن وحشت کا طریقۂ اصلاح اور اصلاحی نوٹ کی ایک دستاویزی حیثیت ہے۔ ایسا کئی جگہوں پر دیکھنے میں آیا کہ کہیں وحشت دل شمع نصیب کو غلط قرار دیتے ہوئے دل شمع صفت کی ترکیب کا استعمال کر کے شعر سے معنوی سقم دور کر دیتے ہیں تو کہیں واقعاتی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شوق کا شعر تھا۔

غضب ہوا دلِ صبر آزما نے لوٹ لیا
فریب دے کے مجھے رہنما نے لوٹ لیا

مولانا کا اعتراض یہ تھا کہ دلِ صبر آزما کے لیے لوٹنا کسی قدر بدیع ہے۔ پتہ نہیں انھوں نے صرف بدیع کہا ہے یا بدیع سے دوری لکھا ہے تاہم یہ بات تو صاف نظر آتی ہے کہ انھیں لوٹنے کی رعایت سے دلِ صبر آزما میں کھوٹ نظر آیا لہٰذا انھوں نے مصرعۂ اول میں دلِ صبر آزما کو نگہہِ آشنا

سے بدل کر ربط پیدا کر دیا۔

غضب ہوا نگہہ آشنا نے لوٹ لیا
فریب دے کے مجھے رہنما نے لوٹ لیا

اس ترمیم سے نہ صرف یہ کہ مصرعے مربوط ہو گئے بلکہ رہنما کی رعایت سے نگہہ آشنا کا غضب ڈھانا نیز رہنما کے لیے یہ شرط کہ وہ نگاہ آشنا بھی ہو اور جب ایسا رہنما فریب دے تو شعر کا معنوی اُفق بہت حد تک پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی یہ عام رجحان ہے کہ اُسی رہنما کو ترجیح دیتے ہیں جو کسی نہ کسی رشتے سے (بلحاظ قوم، نسل، زبان و مذہب) جانا پہچانا ہے۔ اس معمولی سی ترمیم نے شعر میں ایک نوع کی لطافت پیدا کر دی۔

وحشت لطفِ زبان کے قائل تھے اور اس حد تک کہ اگر بات انتخاب کی ہو تو وہ مضمون پر لطفِ زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی غزلوں میں مسلسل تحریف کر کے مزید رواں اور پُر تاثیر بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

''شکستِ ناروا سے میں خود بچتا ہوں کیونکہ پرانے اسکول کا ہوں'' ایک اور خط میں لکھتے ہیں'' میں پرانی لکیر کا فقیر ہوں اور ایطا سے بچتا ہوں۔'' اپنے شاگرد شاکر کلکتوی کو جو خط لکھا اس سے ان کے نظریۂ فن سے پوری آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس طرح بھی وہ اپنے شاگردان کی ذہنی تربیت فرماتے۔ ملاحظہ ہو۔

''میں غیر مانوس بحروں میں غزل نہیں کہتا اور نہ پسند کرتا ہوں جو کلام کہ کانوں کو موزوں نہ معلوم ہو وہ بے لذت ہے۔ آج کل ترقی پسندوں نے اس قسم کی بحروں کو رواج دیا ہے جن میں وہ بہت سے ناموزوں شعر بھی کہہ جاتے ہیں''

مکاتیب وحشت صفحہ 66)

وحشت قدرتِ زبان پر زور دیتے جو کسی بھی تخلیق کے لیے بنیادی شرط ہے۔ نثر ہو یا نظم ہر زبان کی کچھ بنیادی خصوصیات ہیں جن کے بغیر تخلیق یخ بستہ چیز معلوم ہوتی ہے۔ تخلیق کے رنگ روپ کے فروغ میں زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جن کی مخصوص خصوصیات نثر کو نظم سے اور نظم کو شعر سے الگ کرتی ہیں۔ وحشت فرماتے ہیں۔

''آج کل نظموں کے لکھنے کا رواج ہے اور وہ لوگ جنھوں نے فنِ شعر کو با قاعدہ حاصل نہیں کیا ہے، طبع آزمائی کرتے ہیں اور مہمل بکتے ہیں۔ نظمیں بے سر و پا ہوتی ہیں۔ الفاظ کو معنی سے تعلق نہیں ہوتا۔ الفاظ ادائے مطلب کے لیے ہیں لہٰذا ہر لفظ سوچ سمجھ کر لکھنا چاہیے کہ بے ضرورت نہ ہو اور مصرعے کو مصرعے سے پورا ربط ہو'' (مکاتیب وحشت صفحہ 80)

وحشت نے یہ حد صرف اپنے شاگردوں پر ہی نہیں بلکہ خود پر بھی قائم رکھی۔ اگر وحشت کی ابتدائی دور کی غزلیہ شاعری پر غور کریں تو یہی رویہ غالب نظر آتا ہے کہ لفظیات کا منضبط استعمال ہو، مضمون کی پیشکش میں ندرت ہو، زبان فصیح اور شستہ ہو اور شعر میں مکالمہ بننے کی صلاحیت ہو۔ وحشت کا شعر ہے۔

کلام جس سے عوام خوش ہوں نہیں ہے مرغوب میرے دل کو
جسے زمانے نے رد کیا ہے وہی مرے انتخاب میں ہے

میں یہاں صرف ایک شعر کی مثال پیش کرتا ہوں جو پہلی بار دیوان اول میں شائع ہوا لیکن دوسری اشاعت میں علامہ نے متن میں ترمیم کر دی۔ وجہ آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔ شعر کی غیر ترمیم شدہ شکل یہ تھی۔

شوق کا عالم مرے دیکھا نہیں تو نے ہنوز
ہے حیا تجھ کو حیا کا امتحاں ہو جائے گا

اب ترمیم ملاحظہ ہو: دیکھیے شعر میں کیسی روانی پیدا ہو گئی ہے۔

تو نے میرے شوق کا عالم نہیں دیکھا ہنوز
ہے حیا تجھ کو حیا کا امتحاں ہو جائے گا

یہی نہیں بلکہ مولانا نے ایسے بہت سارے اشعار قلم زد کر دیے جو دیوانِ اول میں شامل تھے اور جب ترانۂ وحشت شائع ہوا تو وہاں سے خارج تھے۔ اس ضمن میں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے وحشت کی تنقیحات سے متعلق ایک عالمانہ مضمون سپردِ قلم کیا جسے وحشت صدی کے موقع پر مجلۂ سوغات میں شائع کیا گیا تھا۔ وحشت شناسی کے باب میں یہ مضمون ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

انتخابِ کلام

انتخاب از دیوانِ وحشت

سالِ اشاعت 1910

خوبیِ اشعارِ وحشت کا نہ کچھ پوچھو مزہ
میر و مرزا کا زمانِ شاعری یاد آ گیا
مصرعۂ تاریخ کی مجھ پر بھی لازم آئی فکر
گو نہیں تاریخ گوئی سے مجھے کچھ واسطہ
دیکھ کر حسرت مجھے اس درجہ سرگرمِ تلاش
بول اُٹھا ہاتف "جوابِ میر و غالب ہے چھپا"

مولانا حسرت موہانی

غزلیات

آئینۂ خیال تھا عکس پذیرِ راز کا　　طور شہید ہوگیا جلوۂ دلنواز کا
پایہ بہت کیا بلند اس نے حریمِ ناز کا　　تا نہ پہنچ سکے غبار رہ گذرِ نیاز کا
خستگیِ کلیم نے نکتہ عجب بجھا دیا　　ورنہ حریف میں بھی تھا اس مژدۂ دراز کا
دیر ملا تھا راہ میں کعبے کا ہم نکل گئے　　جذبۂ شوق میں دماغ کس کو امتیاز کا
بندگی وصاحبی اصل میں دونوں ایک ہیں　　جس کا غلام ایاز ہے وہ ہے غلام ایاز کا
کوتہیِ نصیب نے دور رکھا تو کیا ہوا　　بندۂ خانہ زاد ہوں اس کے قدِ دراز کا
شوق ترا ہے موجزن ذوق ترا بہانہ جو　　کھول نہ دیں کہیں بھرم پردہ گیانِ راز کا
مستیِ بیخودی سے یاں آنکھ کھلی نہ حشر تک　　یعنی یہی جواب تھا نرگسِ نیم باز کا
خاک میں مل گئے ولے آنکھ اٹھی نہ شرم سے　　ہم سے ہوا نہ حق ادا اُس کی نگاہِ ناز کا

مطربِ خلد کیا سُنائے وحشتِ خستہ کیا سُنے
معتقدِ قدیم ہے زمزمۂ حجاز کا

دیر تک شورِ تبسمِ نمک افشاں نہ رہا　　زخمِ کو دل سے ندامت ہے کہ پنہاں نہ رہا
کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے　　خبر اتنی ہے سلامت مرا ایماں نہ رہا
جان دینے سے مجھے دادِ وفا تھی مطلوب　　بے وفا چار گھڑی بھی تو پشیماں نہ رہا
بن گیا میں ہمہ تن شیوۂ عجز و تسلیم　　مجھ کو اندیشۂ بے مہریِ جاناں نہ رہا
تو ہوا گرم عطا کیا کہ بڑھا ذوقِ طلب　　کہہ بھی سکتا ہوں کہ دل میں کوئی ارماں نہ رہا

مل گئی وحشتِ دیوانہ کو تھوڑی سی زمیں
اب وہ ہنگامہ سرِ کوچۂ جاناں نہ رہا

حریفِ دیدۂ دیدار ہو حجاب اس کا نگاہ آشنا ہے مجھ کو ہر تارِ نقاب اس کا
غضب ساقی کی بدمستی، ستم جوشِ شباب اس کا چھلک پڑتا ہے اس کے ہاتھ سے جامِ شراب اس کا
ہے آئینہ عرق آلود، تھا پاسِ حجاب اس کا یہ میری سادگی تھی میں نے ڈھونڈا تھا جواب اس کا
ہزاروں اس کے قدموں پر تھے مشتاقِ گرفتاری مرے ہی دل کو چھانٹا دیکھنا تو انتخاب اس کا
مجسّم مہر ہے، ہر چند مہر اس کی بلا نکلی تری چشمِ حیا پرور کہ عالم ہے خراب اس کا
ہے ارزاں اس قدر دیدارِ جاناں ہم نہ مانیں گے زلیخا کیا سناتی ہے خیال اس کا ہے خواب اس کا
کرم کی ہے نظر اُفتادگانِ خاک پر دائم محافظ ہے دلوں کا طرۂ عالی جناب اس کا
ستم ہے قطعِ امید، آہ کیسا ہوگیا ٹھنڈا دلِ شیدا کہ اک طوفاں تھا گو اضطراب اس کا
وہ زلفِ خم بخم کب ہاتھ اُٹھاتی ہے مرے سر سے گرہ ہو کر رہا ہے میرے دل میں پیچ و تاب اس کا

کلامِ عرفیِ شیراز ہے تقلید کے قابل
ہمارے رشحے میں دیکھ لے وحشت جواب اس کا

نزاکت سے اگر سررشتۂ مہر و وفا چھوٹا تو کیوں اس دستِ نازک سے نہ پھر رنگِ حنا چھوٹا
کہاں کا قبلہ، کیسا کعبہ، کس کا سر کہاں سجدہ چھٹے دونوں جہاں جس دن سے تیرا نقشِ پا چھوٹا
وہ شوخ سرو قد بگڑا غلامِ پیر سے اپنے جدا ہونا تھا اس کا ہاتھ سے گویا عصا چھوٹا
ہوئی گر گفتگو اُس سے نہ آئی بات مطلب کی کیا تحریر اگر نامہ تو حرفِ مدعا چھوٹا

چلی بیتاب ہو کر پیچھے پیچھے بوئے گل وحشت
اگر دستِ چمن سے دامنِ بادِ صبا چھوٹا

غیر ہی کا غم ترا ہمدم رہا — وائے وہ دل جس میں تیرا غم رہا
بے کسی پہروں تماشائی رہی — تیرے کشتے پر عجب عالم رہا
سن چکا ہوں ماجرائے حسن و عشق — بیشتر کارِ جہاں برہم رہا
اس صنم کی بے نیازی ہائے ہائے — مضطرب کتنا لبوں پر دم رہا
عالمِ وارفتگی کی کیفیت — کیا کہوں ہمدم کہ اک عالم رہا
دہرِ فانی ہے عجب عبرت کدہ — دیدۂ اہلِ نظر پر نم رہا
عشق کی خانہ خرابی کچھ نہ پوچھ — حسن کا مجموعہ بھی برہم رہا
ہائے تیری آشنا بیگانگی — مدتوں میں بھی ترا محرم رہا
اے زہے دردِ فراقِ جاں گداز — خاطرِ محزوں میں جو پیہم رہا
اشکِ بلبل پر نہ رونا آئے کیوں — روئے گل شرمندۂ شبنم رہا
ہائے وہ عالم کسی کے حسن کا — دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا
مژدۂ عشرت تجھے اے زلفِ یار — حال میرا بھی بہت برہم رہا
پھر گئی جس دن سے ساقی کی نگاہ — لطفِ مے سے ذوق مجھ کو کم رہا
گاہ وہ دشمن بنا اور گاہ دوست — ربط یوں بھی کچھ دنوں باہم رہا
مجھ کو اتنا ہی رہا اس سے لگاؤ — جس قدر کافر کو مجھ سے رم رہا

وائے وضعِ وحشتِ وحشی مزاج
جس سے اُس نا آشنا کو رم رہا

مجھ کو یہ جوشِ بہار اک دن خزاں ہو جائے گا　　موجِ گل کا جلوہ برقِ آشیاں ہو جائے گا
سوزِ پنہانی مرا تجھ پر عیاں ہو جائے گا　　دردِ دل حد سے سوا ہو کر زباں ہو جائے گا
مجھ سے گر حالِ زبوں میرا بیاں ہو جائے گا　　نغمۂ تیری محفل میں فغاں ہو جائے گا
رحم آ جائے گا کچھ مجھ کو بھی میرے حال پر　　جس گھڑی اغیار پر تو مہرباں ہو جائے گا
جب تری بے گانہ خوئی کا کروں گا میں گلہ　　دیکھنا دشمن بھی میرا ہم زباں ہو جائے گا
میں سُبک سر بن کے یوں گرتا نہ قدموں پر ترے　　مجھ کو کیا معلوم تھا تو سرگراں ہو جائے گا
گر ستم ہائے تغافل کا یہی عالم رہا　　غنچۂ دل ایک زخمِ خوں چکاں ہو جائے گا
تو نے میرے شوق کا عالم نہیں دیکھا ہنوز　　ہے حیا تجھ کو حیا کا امتحاں ہو جائے گا
مضطرب تو بھی ہوا مجھ سا تو دل کا اضطراب　　باعثِ تسکینِ جانِ ناتواں ہو جائے گا

پیچھے پیچھے تیرے ہوگا اہلِ فن کا قافلہ
وحشت اک دن تو ہی میرِ کارواں ہو جائے گا

قدم اٹھتا ہی نہ ہو جب تو سفر کیا ہوگا　　اور جو گھر میں نہیں دلدار تو گھر کیا ہوگا
گرمیِ داغ سے اپنا تو جگر سوکھ گیا　　اس طراوت سے تری دیدۂ تر کیا ہوگا
تیری دیوار مگر اس کی خبر کو پہنچے　　تیرے در کا نہ ہوا سنگ تو سر کیا ہوگا
ہے ترے وصل کو درکار فنا کی تعلیم　　قطرہ دریا سے گریزاں ہے، گہر کیا ہوگا
حالِ دل سوختگانِ ستمِ کم نظرے　　اے زیارت گہِ اربابِ نظر، کیا ہوگا
پاس منظور ہے اس پردہ نشیں کا مجھ کو　　تیری امداد سے اے روزنِ در کیا ہوگا

وسعتِ فہم سے یاروں کی ہے وحشت آگاہ
اس ستم دیدہ سے اظہارِ ہنر کیا ہوگا

سنگِ طفلاں فدائے سر نہ ہوا آج اس کوچے میں گذر نہ ہوا
ہم بھی تھے جوہرِ گراں مایہ پر کوئی صاحبِ نظر نہ ہوا
امن عالم میں کیوں نہیں یارب اس کے قابل مگر بشر نہ ہوا
بیکسی پردہ دارِ درد ہوئی خیر گزری کہ اپنا گھر نہ ہوا
قدردانی کی کیفیت معلوم عیب کیا ہے اگر ہنر نہ ہوا
سر جھکائے جو آتے ہو وحشت
مگر اُس بزم میں گزر نہ ہوا

دل رفتہ رفتہ خوگرِ آزار ہوگیا غم تھا بہت مجھے وہی غم خوار ہوگیا
تھا شوقِ پائے بوس بھی ہنگامہ آفریں وہ شوخ خوابِ ناز سے بیدار ہوگیا
جانِ حزیں نکل ہی گئی کشمکش کے ساتھ سختی کشِ فراق سُبک سار ہوگیا
نے چشمِ التفات ہے نے خنجرِ عتاب جینا تمھارے عشق میں دشوار ہوگیا
اب عام ہے وہ لطف کہ تھا خاص میرے ساتھ جو دل نواز تھا وہ دل آزار ہوگیا
تھا حسنِ خود فروش کچھ ایسا ہی دلفریب میں جی کو بیچ کر جو خریدار ہوگیا
میں سادہ لوح واقفِ رسمِ بُتاں نہ تھا اقرارِ عشق کر کے گنہگار ہوگیا
وہ دل کہ تھا حریفِ ستم ہائے روزگار آخر کو پائمالِ غمِ یار ہوگیا
وحشت دراز دستیِ زلفِ صنم نہ تھی
میں آپ بیخودانہ گرفتار ہوگیا

عبث تھی یہ مدعا طرازی، نہ تھا جو مقدورِ جستجو کا
ہوا ہوں مجروحِ ناامیدی، خراب ہو خانہ آرزو کا

نگاہ کتنی ہے بیکسانہ ٹپک رہی ہے بلا کی حسرت
صدا ہے گویا مری خموشی، شہید ہوں ذوقِ گفتگو کا

دل و جگر خون کر رہی ہے سرورِ عشرت کی ناتمامی
شرابخانے میں تیرے ساقی ہے کام کیا ساغر و سبو کا

کبھی میں گستاخ تھا تپش میں، کبھی میں لٹنے میں بے محابا
نہ ڈھنگ آیا نماز ہی کا، نہ کچھ سلیقہ مجھے وضو کا

بنے گا ذوقِ عطا خود اس کا محرکِ آشنا نوازی
طلب کی خاطر دراز کرنا ضرور کیا دستِ آرزو کا

دماغ میخانہ بے خودی کا ، نگاہ آئینۂ تحیر
عجیب کیفیتیں ہیں وحشت فریب خوردہ ہوں رنگ و بو کا

جب تھا ستم رقیب پہ، بندے کا غم نہ تھا
کب اس ستم رسیدہ پہ صاحب ستم نہ تھا

ہاں حسرتِ ستم کی خلش تھی کوئی تو تھی
تیرے ستم کشیدہ کے سینے میں دم نہ تھا

چلتا رہا ہمیشہ میں اک طرزِ خاص پر
یعنی فریب خوردۂ دیر و حرم نہ تھا

تیرے ہی ذوقِ جلوہ سے وا ہوگئی ہے چشم
یاں ورنہ امتیازِ وجود و عدم نہ تھا

اس کار گاہِ ہستیِ بے اعتبار میں
اچھا رہا وہ جس کو کہ ہستی کا غم نہ تھا

اللہ ری دلفریبیِ اندازِ ضبطِ عشق
اک موجِ خوں تھی دل میں اور آنکھوں میں نم نہ تھا

احسان ہے طریقتِ وقت پسند کا
یعنی کہ رہنما کوئی نقشِ قدم نہ تھا

تو مجھ سے آشنا نہ ہوا گر تو کیا ہوا
تیرا خیال میری تسلی کو کم نہ تھا

اس دشتِ ہولناک سے مجھ کو رہا ہے کام
جس راہ میں قدم بھی مرا ہم قدم نہ تھا

اس حسنِ امتیاز کے قربان جایئے
تھا اک جہاں سے، پر اُسے وحشت سے رم نہ تھا

آہِ شب نالۂ سحر لے کر　　نکلے ہم توشۂ سفر لے کر
شغل ہے نالہ ، کچھ مراد نہیں　　کیا کروں اے فلک اثر لے کر
تیری محفل کا یار کیا کہنا　　ہم بھی نکلے ہیں چشمِ تر لے کر
آپ میں نے دیا دل اس بت کو　　جھک گئی شاخ خود ثمر لے کر
تھا قفس کا خیال دامن گیر　　اُڑ سکے ہم نہ بال و پر لے کر

وحشت اس بزم میں رہے تھے رات
صبح نکلے ہیں. دردِ سر لے کر

اُٹھ سکا نہ غم مرا خانۂ یار دیکھ کر　　رہ گئی چشمِ آرزو نقش و نگار دیکھ کر
بزمِ نشاط سے کبھی مجھ کو بھی تھی مناسبت　　آج ہوئی ہے چشمِ تر ابرِ بہار دیکھ کر
رشک کہاں، حسد کسے، اور مجھے خوشی ہوئی　　غم میں ترے رقیب کو سینہ فگار دیکھ کر
خوب نہیں یہ اختلاط ، کھیل نہیں یہ دوستی　　اے غمِ یار سوچ کر، اے دلِ زار دیکھ کر
حالِ چمن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا　　اپنا جو حال ہوگیا رنگِ بہار دیکھ کر
ان سے امید کیا رکھوں رحم نہ آئے جب انھیں　　سینے کو چاک دیکھ کر دل کو فگار دیکھ کر
طبع کی ہائے نازکی عشق میں بھی غیور ہوں　　دل میں ترے جگہ نہ کی میں نے غبار دیکھ کر
جتنے ادا شناس تھے ہوگئے مست بے پیے　　ساقیِ بزمِ ناز کو بادہ گسار دیکھ کر
خاک پہ میری نوحہ گر میری ہی بیکسی رہی　　آج صبا بھی آئی ہے شمعِ مزار دیکھ کر

وحشتِ خستہ ہاں سُنا مجھ کو وہ شمس کی غزل
''رونے لگے وہ زار زار سوئے مزار دیکھ کر''

گر فیض چاہیے درِ پیرِ مغاں نہ چھوڑ　　چھوٹے زمانہ چھوڑ دے یہ آستاں نہ چھوڑ
کچھ کچھ ستم ضرور ہو لطف و کرم کے ساتھ　　یہ رسمِ عشق ہے اسے اے مہرباں نہ چھوڑ
حاصل ہوا نہ گر ترا مطلب تو کیا ہوا　　اے دل یہ شغلِ نالۂ آتش فشاں نہ چھوڑ
عزلت نشیں رہا تو بلاؤں سے بچ گیا　　صیاد تیرے تاک میں ہے آشیاں نہ چھوڑ
وحشت کمالِ شعر فصاحت کا نام ہے
مضمون کے خیال میں لطفِ زباں نہ چھوڑ

دلِ خستہ ذوقِ الم سے خوش، غمِ یار اپنے اثر سے خوش　　جو یہ غیر کے ہے ضرر سے خوش تو وہ آپ اپنے ضرر سے خوش
یہی رسمِ منزلِ عشق ہے کہ ہیں سب پلے ضرر سے خوش　　جو مژہ ہے پارۂ دل سے خوش تو ہے چشمِ لختِ جگر سے خوش
نہ خیالِ ذوقِ وصال کا نہ دماغ بزمِ نشاط کا　　وہی مجھ کو عیشِ دوام ہے جو کرے تو ایک نظر سے خوش
ہر اک اپنے رنگ میں محو ہے یہ ہے لطف وادیِ عشق میں　　جو خوشی ہے صید کو زخم کی تو کماں کش اپنے ہنر سے خوش
جو ہے ربطِ چشم کو اشک سے تو لگاؤ دل کو ہے زخم سے　　یہ صدف ہے اپنے گہر سے خوش یہ شجر ہے اپنے ثمر سے خوش
ہے تلوّن اُن کے خمیر میں مجھے اعتماد ہو ان پہ کیا　　جو عدو سے اُن کی بگڑ گئی تو میں کیوں ہوں اُس کی خبر سے خوش
وہی ایک ذوقِ خیال ہے نہ الم ہے کچھ نہ ملال ہے　　یہ کمالِ شانِ جمال ہے طلب و جاں ہے جس کے اثر سے خوش
مری طبعِ نکتہ شناس کی وہ نزاکتوں کو تو دیکھ لیں　　انھیں نازکی کا غرور ہے کہ ہوئے ہیں اپنی کمر سے خوش
کوئی صبح ایسی ہوئی نہیں کہ چمن میں تو مرے ساتھ ہو　　دلِ ناشگفتہ مرا کبھی نہ ہوا نسیمِ سحر سے خوش
اثرِ زمانِ گزشتہ کچھ جو ہے دستیاب تو ہے یہی　　تری یادگار اسے جان کر میں ہوں اپنے داغِ جگر سے خوش
الم شکستگیِ قدم ہے کفیلِ عشرتِ جاں فزا　　جو دیارِ یار کا ہو سفر تو ہو کون پھر نہ سفر سے خوش
مری خستگی سے جو شاد ہے یہ کچھ اس کی سنگدلی نہیں　　ہے دل اس کا بھی الم آشنا کہ ہے میرے دردِ جگر سے خوش
دل و جانِ وحشتِ بے نوا ہے شہیدِ لذتِ شعر کا
کوئی خوش ہو یا نہ ہو اُس کو کیا، وہ ہے آپ اپنے ہنر سے خوش

شوق پھر کوچۂ جاناں کا ستاتا ہے مجھے میں کہاں جاتا ہوں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
جلوہ کس آئینہ رو کا ہے نگاہوں میں کہ پھر دلِ حیرت زدہ آئینہ بناتا ہے مجھے
عاشقی شیوہ لڑکپن سے ہے اپنا ناصح کیا کروں میں کہ یہی کام کچھ آتا ہے مجھے
لطف کر لطف کہ پھر مجھ کو نہ دیکھے گا کبھی یاد رکھ یاد کہ تو در سے اُٹھاتا ہے مجھے
وحشت اس مصرعِ جرأت نے مجھے مست کیا
کچھ تو بھایا ہے کہ اب کچھ نہیں بھاتا ہے مجھے

ترا خیال شریکِ بلاکشاں کیوں ہو وصال کا المِ ہجر پر گماں کیوں ہو
ہے آشیاں سے کہاں برق کی بلا کو غرض حریفِ یک دو خس و خارِ گلستاں کیوں ہو
رقیب سے بھی وہی میٹھی میٹھی باتیں ہیں تری روش پہ مجھے مہر کا گماں کیوں ہو
پسندِ خلق ہوئی ہے ستم گری اس کی یونہی عزیز جہاں ہے وہ مہرباں کیوں ہو
کرو رقیب پہ کیوں ظلم میں تو حاضر ہوں گلہ تمھارے ستم کا یہاں وہاں کیوں ہو
سنا جو نالۂ جانکاہ کس ادا سے کہا یہ داستانِ محبت ہے خوں چکاں کیوں ہو
نہ ہو جو غم کا طلبگار وہ جگر کیا ہے نہ ہو جو حق کی طرفدار وہ زباں کیوں ہو
مجھے تو لائی ہے شامت عدو کی محفل میں کوئی تو ان سے یہ پوچھے کہ تم یہاں کیوں ہو
ملے رقیب سے وہ اور مجھ سے فرمایا جو اعتماد ہے مجھ پر تو بدگماں کیوں ہو
کہا کسی نے کہ اربابِ آرزو کے لیے خیالِ کلفتِ ہجراں بلائے جاں کیوں ہو
نہیں ہے مہر و وفا ہی کی جب مجھے پروا تو میری مہر و وفا کا پھر امتحاں کیوں ہو
فغاں ہے شیوۂ آزردہ خاطراں اے دل ترا ستم زدہ پامالِ آسماں کیوں ہو
قدم لیے جو تمھارے سبک سری تھی مری خدا کے واسطے تم اتنے سرگراں کیوں ہو
نظر چرا کے بھی جاؤ نہ اپنے بسمل سے اگر چہ چشمِ کرم بہرِ کشتگاں کیوں ہو
مشاعرے میں غزل اپنی کیوں پڑھی وحشت
جنوں کا راز سرِ بزم یوں عیاں کیوں ہو

تو ہے آفریدہ پئے طرب، مرے غم میں چشم کو تر نہ کر
مری خستگی سے حزیں نہ ہو مری بیکسی پہ نظر نہ کر

نہ اُٹھا اے خروشِ سحر گہی، غمِ نیم شب تو اثر نہ کر
ہے دل اس کا نازک و بے خبر اُسے میرے حال کی خبر نہ کر

ہوسِ وصال بلا ہے تو، تری کاوشوں نے ستم کیا
تو نہالِ گلشنِ یاس ہے، عبث آرزوئے ثمر نہ کر

ہے یہی خلش مری زندگی کہیں مٹ نہ جائے یہ چارہ گر
مری زیست کا جو خیال ہے تو علاجِ زخمِ جگر نہ کر

نہیں پائمالیِ عاشقاں بجز اک نظر کا معاملہ
ترے اختیار کی بات ہے جو کرے یہ کام مگر نہ کر

ہے تغافل ایک ادا و لے یہ سکھایا کس نے بھلا تجھے
کہ کسی ستم کشِ شوق پر کبھی بھول کر بھی نظر نہ کر

خلشِ امید ہے جاں گزا کوئی کہہ دے وحشتِ خستہ سے
کہ یہ شام شامِ فراق ہے، عبث آرزوئے سحر نہ کر

نوحہ خواں ہے جگرِ خستہ دلِ زار کے پاس
دیکھیے کیا ہو کہ بیمار ہے بیمار کے پاس

جنس کاسد ہوں جو رد کردہ بازار ہوں میں
کوئی لے جائے مجھے میرے خریدار کے پاس

نہ اُسے زہر ہی ملتی ہے نہ آتی ہے دوا
جز تاسف نہیں کچھ بھی مرے غم خوار کے پاس

میرے صیاد کی دیکھے کوئی دور اندیشی
دام ہوتا ہے دھرا مرغِ گرفتار کے پاس

روکتے ہیں مجھے احباب بھی اور دشمن بھی
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے مجھے یار کے پاس

خود بنے طالبِ دیدار زہے جذبۂ شوق
اُڑ گئی اُن کی حیا طالبِ دیدار کے پاس

دیکھ لے تو بھی کہ تیرا کوئی وحشت تو نہیں
کوئی دیوانہ کھڑا ہے تری دیوار کے پاس

آوارہ جو تیرا ہوا اُس کو وطن سے کیا غرض
بازار میں جب آچکا گل کو چمن سے کیا غرض

قرباں تصور کے ترے روشن مرا کاشانہ ہے
خلوت ہوا پنی انجمن تو انجمن سے کیا غرض

گر لے نہ دامن کی خبر تو ہاتھ سے کیا فائدہ
جب چاک کے قابل نہیں تو پیرہن سے کیا غرض

دیوانہ کر سکتی نہیں جس سنگ دل کو بوئے گل
سمجھے وہ لطفِ شعر کیا اُس کو سخن سے کیا غرض

ہے اپنے عیشِ رفتہ سے ساری سیہ مستی مری
ساقی پرانا رند ہوں جامِ کہن سے کیا غرض

ہے غرق اپنے خون میں گلگوں ہے اس کا پیرہن
تیرے شہیدِ ناز کو غسل و کفن سے کیا غرض

اک بیخودی سی گر رہی وحشت تو کافی ہے یہی
مجذوبیت کا رنگ کیوں، دیوانہ پن سے کیا غرض

کہتے ہیں وہ کہ نالہ ہو آتش فشاں غلط
سوزِ دروں غلط غمِ عشقِ نہاں غلط

سب اپنے کاروبار میں دن رات خوش رہیں
عشاق پہ ہی ہو ستمِ آسماں غلط

ہاں سینہ سوزیِ دلِ آتش نفس دروغ
ہاں دجلہ ریزیِ مژۂ خوں فشاں غلط

معشوق عاشقوں کو کرے قتل افترا
اور مرنے والے موت سے ہوں شادماں غلط

ہو مثلِ مرغِ اہلِ سخن کا بھی آشیاں
اور برق کی نظر ہو سوئے آشیاں غلط

ہے شاعروں کا شیوہ شکایت زمانے کی
ملتا نہیں جہاں میں کوئی قدر داں غلط

وحشت مری زباں کو تو اہلِ زباں سے پوچھ
ماہر زباں کے ہوں فقط اہلِ زباں غلط

نہ ہے سیرِ صحرا نہ گلگشتِ باغ رہا جب نہ دل تو رہے کیا دماغ
امیری فقیری کا ہے ایک حال زمانے میں حاصل ہے کس کو فراغ
نہ جانوں کبھی دل بھی تھا یا نہ تھا مجھے تو یہی اک نظر آیا داغ
بہت حسرت افزا ہے شمعِ مزار بجھایا مجھے جب جلایا چراغ
مجھے جی کا کھونا ہوا اب ضرور کہ گم گشتہ دل کا نہ پایا سُراغ
اُٹھائیں نہ کیا کیا پشیمانیاں رہا دوستی کا نہ مجھ کو دماغ
ہے وحشت مجھے ماتمِ مرگِ قیس
وہی اک تھا صحرا کا چشم و چراغ

نوائے بلبلاں ہے یا ہوئی ہے لالہ کار آتش گل آتش، غنچہ آتش، گلستاں آتش، بہار آتش
اگر صیائے عشق آنکھوں سے بہتے بہتے رُک جائے لگاتے پیکرِ عشاق میں روئے نگار آتش
ستم کرنا کسی پر باعثِ اندوہ خاطر ہے سپندِ مضطرب کے درد سے ہے بیقرار آتش
نہ پہنچائے طراوت قطرۂ شبنم اگر گل کو گلستاں میں لگادے تابشِ رخسارِ یار آتش
وہ شوخِ سنگدل اظہارِ یاری مجھ سے کرتا ہے ہوئی پروانۂ آتش بجاں کی غم گسار آتش
ہمیں بیجا ہے وحشت شکوہ اس کی بددماغی کا
کہ ہوں عاشق اگر پیدا نہ ہو گر خوئے یار آتش

بیتابیاں تھیں شوق کی، اُس کا تماشا اک طرف
جاں مضطرب تھی اک طرف دل ٹوٹتا تھا اک طرف

اے وائے تیری جستجو، اے وائے تیری آرزو
مرگِ تحمل اک طرف خونِ تمنا اک طرف

خوش جلوۂ ناز آفریں، خوش شیوۂ چینِ جبیں
عاشق کی پروا اک طرف لطف و مداوا اک طرف

آہوں کا ہنگامہ ستم اشکوں کی طغیانی غضب
برپا ہے طوفاں اک طرف جاری ہے دریا اک طرف

کیا پوچھتا ہے حالِ دل جرمِ الفت سے خجل
آنکھ اپنی اُٹھ سکتی نہیں عرضِ تمنا اک طرف

ہم طرحِ اکمل مجھے وحشت عبث ہے آرزو
اک شعر تک ہوتا نہیں لکھنا غزل کا اک طرف

•

قسمت میں ناامیدیِ حسرت ہے کیا کروں
اُس بے وفا سے مجھ کو محبت ہے کیا کروں

کس کو خبر نہیں ہے کہ دیتا ہے وہ فریب
دل کو فریب کھانے کی عادت ہے کیا کروں

میں بے مروّت اس کو کہوں گا نہ زینہار
یہ اقتضائے رسمِ مروّت ہے کیا کروں

تقلیدِ وضعِ بوالہوساں کا کسے دماغ
میری روش سے یار کو نفرت ہے کیا کروں

شدت نے صدمہ ہائے نہاں کی ستم کیا
تیرے ستم کی لب پہ شکایت ہے کیا کروں

ہے خارِ چشم اب خس و خاشاکِ آشیاں
ہنگامۂ بہار کی رخصت ہے کیا کروں

بگڑے جو اپنی بات تو قسمت سے کیا بنے
آئے کسی پہ دل تو طبیعت ہے کیا کروں

قائل ہوں خوش کلامیِ واعظ کا میں ولے
پیرِ مغاں سے مجھ کو عقیدت ہے کیا کروں

سرگرمِ اشتیاق ہوں جلتا ہوں مثلِ شمع
موز و گداز سے مری طینت ہے کیا کروں

وحشت مجھے غلامیِ درباں قبول ہے
تنہائیِ فراق سے وحشت ہے کیا کروں

وحشتِ جتلا خدا کے لیے جان دیتا ہے کیوں وفا کے لیے
آشنا سب ہوئے ہیں بیگانے ایک بیگانہ آشنا کے لیے
ہم نے عالم سے بے وفائی کی ایک معشوقِ بے وفا کے لیے
تھا اُسے ذوقِ عاشق آزاری خوب میں نے مزے جفا کے لیے
غالب آئی فراموشی اس کی وعدہ تڑپا کیا وفا کے لیے
یہ بھی تیری گدا نوازی تھی میں بوسے جو نقشِ پا کے لیے
ذوقِ نظارہ نے کیا ہے خاک سرمہ ہوں چشمِ سرمہ سا کے لیے
جُستجو تنگِ آرزو نکلی درد رُسوا ہوا دوا کے لیے
بڑھ چلی ہے بہت حیا تیری مجھ کو رُسوا نہ کر خدا کے لیے
ہے خموشی مجھے زباں وحشت
فکر کیا عرضِ مدّعا کے لیے

رشکِ نظارہ بازیِ اغیار بھی نہیں یعنی کہ ہم کو اب غمِ دیدار بھی نہیں
کیا کیجیے کرشمۂ صیاد کا بیاں آزاد بھی نہیں ہیں گرفتار بھی نہیں
روتا ہے التفات کا ، الطاف اک طرف اب تو وہ میرے درپۂ آزار بھی نہیں
تو چھوڑ غیر کو کہ مجھے تیرا چھوڑنا آساں اگر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں
پھوٹے ہوں جب نصیب تو سر پھوڑنا کہاں دیوار ڈھونڈتا ہوں تو دیوار بھی نہیں
ہنگامۂ تراوشِ لختِ جگر کہاں ناداریوں سے اب مژہ خونبار بھی نہیں
وحشت ہمیں تتبعِ غالب ہے آرزو
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

مبارک اور گل چیں ہو کوئی تیرے گلستاں کو   کہ ہم تو پائمالِ چمن کر لے چلے گلہائے حرماں کو
مسرت سے جو رقصاں دیکھتا ہوں تیری مژگاں کو   کہیں بیدرد نے چھیڑا نہ ہو میری رگِ جاں کو
مرا تو اس کے نظارے سے ایماں تازہ ہوتا ہے   خدا رکھے سلامت اس عدوئے دین و ایماں کو
مجھے بیتاب رکھتا ہے یہاں خود ذوقِ بربادی   تمھیں سمجھاؤ کچھ اپنی نگاہِ فتنہ ساماں کو
ترے آنے سے خونِ لالہ و گل جوش میں آیا   لگا دی آگ تیرے حسن نے گویا گلستاں کو
یہی مطلب کی دشواری ہے خود تمہیدِ آسانی   صباحِ وصل کی ہے جستجو شب ہائے ہجراں کو
جو کی ہے اک نظر تو دوسری بھی بندہ پرور ہو   نکالا دل جو سینے سے تو کیوں رہنے دو ارماں کو
مری احوال پرسی کو ہے ہر تار اک زباں گویا   دعا دیتا ہے ہر موئے تن اُس زلفِ پریشاں کو
حریفِ نالہ ہو گر نغمہ نے تیری محفل میں   شرارِ آہ سے میں پھونک دوں سارے نیستاں کو
کہوں کیا سجدہ ہائے شوق کی ہنگامہ آرائی   وہ طوفاں یاد ہے اب تک زمینِ کوئے جاناں کو
قیامت ہے ہمارے کلبۂ احزاں کی تاریکی   جمالِ یار نے روشن کیا کس کے شبستاں کو
ہوائے زخم میں بیتاب ہوں یارب مبارک ہو   خلش میرے جگر کو اور درازی اُس کی مژگاں کو
بھلا اس وحشت آباد جہاں میں دل لگے کیوں کر   پریشاں دیکھتا ہوں ہر طرف خاکِ عزیزاں کو

کلامِ میر پڑھ پڑھ کر ہوا ہوں نکتہ در وحشت
تلمذ ہے اُسی اُستاد سے طبعِ سخنداں کو

خلقت فدائے صنعتِ خلقت طراز ہے   آئینہ محوِ جلوۂ آئینہ ساز ہے
مسجودِ آسماں ہے تری جلوہ گاہِ ناز   کیوں کر نہ ہو کہ کعبۂ اہلِ نیاز ہے
اے حسن! ہو چلی ہے ہوس ہم رکابِ عشق   تجھ سے امیدِ یک نگہِ امتیاز ہے
جاتا ہے کوئی مشغلۂ ذکرِ زلفِ یار   ہرچند جانتا ہوں یہ قصۂ دراز ہے
دردِ نہانِ عشق نے رسوا کیا مجھے   اشکِ چکیدہ آبِ گہر ہائے راز ہے
ہوتا ہے بند توبہ کا دروازہ ہو تو ہو   واعظ میں کیا کروں درِ میخانہ باز ہے

وحشت سخن شناس زمانے میں اب کہاں
کیونکر نہ روئیے کہ طبیعت پہ ناز ہے

دیکھ کر مجھ کو جو وہ حال مرا جان گئے — جی کے ارماں دلِ بیتاب کے قربان گئے
بیقراری سی طبیعت کو لگی رہتی ہے — کس کی شوخی کہ دل و دیں مرے قربان گئے
تا بہ گفتار تمنا کا پہنچنا معلوم — ہم ترے جورِ تغافل کی روش جان گئے
یہی کہہ کر میں برا ہوں کہ "برے ہیں دشمن" — یہ کوئی بری بات تھی کوئی جو برا مان گئے
کچھ تو صورت دلِ بیتاب کی تسکیں کی بھی ہو — یہ تو ہم جان گئے آپ مجھے جان گئے
شدّتِ درد سے بے دردیٔ اناں سمجھے — اپنی حالت پہ نظر کی اُسے پہچان گئے
دیکھ لی آج پریشانیٔ رنگِ تمکیں — نالہ لب تک بھی نہ پہنچا تھا کہ ادسان گئے
پُرفشانی ہے ہماری صیرِ سختیٔ دام — طرزِ آغاز سے انجام کو ہم جان گئے
ہو جفا میں کہ تغافل میں سمجھ ہی لیں گے — ہم ترے لطف کے انداز کو پہچان گئے
اس طرف بھی ہو عنایت کی نظر اے ساقی — ہم بھی اک بار کہیں "لا ترے قربان گئے"
ربط اغیار سے تیرا کسے آتا تھا یقیں — ہم تو کب ماننے والے تھے مگر مان گئے
شوخیٔ عشق کہ ہم ہوگئے رُسوائے جہاں — خوبیٔ حسن کہ سب آپ کو پہچان گئے

ہمسری تیری تو اب ہو نہیں سکتی وحشت
تو فنِ شعر کا استاد ہے ہم مان گئے

نہ نکلے عمر بھر شورِ جنوں دیوانہ کے سر سے — مبادا ہو خجل چاک گریباں صبحِ محشر سے
زباں کو آشنا کر آج ذوقِ آتشِ تر سے — کہ لذت یاب ہونا ہے تجھے کل آبِ کوثر سے
تحیّر سے دیا گویا جوابِ عرضِ بیتابی — حجاب آلودہ ہے آئینہ شوخی ہائے جوہر سے
مبارک ہو تجھے بزمِ نشاط و سیرِ گل لیکن — کبھی کچھ شرم بھی کر عاشقوں کے دیدۂ تر سے
بہشتِ عشق میں اک بہارِ ناز کا زخمی — جراحت کو مری چشمک سی ہے طاؤس کے پَر سے
مری مایوسیوں نے دی مجھے تعلیمِ گستاخی — کہ بیٹھا رہ گذر پر میں اُٹھایا جب مجھے در سے
ارادت ہے مجھے اس ساقیٔ خمخانۂ دل سے — کیا جس نے تہ و بالا جہاں کو ایک ساغر سے
ہمارا شوق ہے شاہد ہماری تیزگامی کا — رہے راہِ فنا میں دو قدم آگے ہی رہبر سے
یہ کثرت تھی معاصی کی کہ ہم مایوس ہوجاتے — اگر شرمندگی ہوتی بھی اپنے دامنِ تر سے
بنے چشم و چراغِ رہ نوردانِ بلا وحشت — کرے دشتِ جنوں گر کسبِ ویرانی مرے گھر سے

انتخاب از ترانۂ وحشت

سالِ اشاعت 1953

اس شمع کے پروانے ہو اے پروانو
یہ جوہر قابل ہے اسے پہچانو
اس رنگ کے سرمست نہ پاؤ گے کہیں
وحشت کی کرو قدر ارے دیوانو

ابوالعلیٰ حکیم ناطق لکھنوی

نہ شوقِ میکدہ چھوٹا نہ سودائے صنم چھوٹا
ہمیں جس شغل کا چسکا پڑا وہ ہم سے کم چھوٹا

جفا پر منحصر ہے شاید ان کی شانِ محبوبی
نہ طرزِ دلبری چھوٹی نہ اندازِ ستم چھوٹا

بتا کیا ہوگیا تھا تیرے نازِ بندہ پرور کو
نیاز آگیں جبیں سے جب ترا نقشِ قدم چھوٹا

فریبِ جلوہ نے تیرے پھرایا دربدر مجھ کو
پرستش دیر کی چھوٹی نہ احرامِ حرم چھوٹا

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیرِ وفا ڈالی
تمھارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

ترے وحشی پہ آخر بے خودی طاری ہوئی ایسی
ترے زلفوں کا سودا بھی ترے سر کی قسم چھوٹا

نہ قائم رہ سکی بنیادِ تعمیرِ ہوس وحشت
ہوائے بوئے گل چھوٹی، خیالِ جامِ جم چھوٹا

ذرّے ذرّے پر جمالِ یار ضو افگن ہوا
گوشے گوشے میں چراغِ آرزو روشن ہوا

کار فرمائے تجلّی جب رُخِ روشن ہوا
برق سے دست و گریباں شوق کا خرمن ہوا

سجدہ گاہِ مست منداں ہے ترا نقشِ قدم
بے نواؤں کا وہی مُلجا وہی مامن ہوا

دیکھنا انداز ابھی اُس نے کماں کھینچی نہ تھی
اس سے پہلے صید قربانِ شکار افگن ہوا

سینے پر ہوتا ہے وحشت طورِ سینا کا گماں
مائلِ عشقِ تصرف وہ رُخِ روشن ہوا

کبھی حرم میں جو میں مائلِ نماز رہا
تو بتکدے میں بھی صد شکر سرفراز رہا

نہ مرے تھا لیے کم یہ تعلقِ باہم
نیازمند رہا ہوں اسی پہ ناز رہا

نہ کی ہوائے خرابی میں دل نے کوتاہی
اسیرِ سلسلۂ گیسوئے دراز رہا

نکل سکا نہ کبھی حلقۂ مجاز سے میں
اگرچہ مجھ کو حقیقت نما مجاز رہا

ہمیں تو ایک معمّہ ہے اس کا جلوۂ ناز
کہ آشکار ہوا اور پھر بھی راز رہا

وفورِ سوز سے کیا کیا ہوا اثر انگیز
وہ دل کا نغمہ کہ جو بے نیازِ ساز رہا

بزعمِ مدعیانِ خرد مرا وحشت
جنوں کا شیوۂ طغرائے امتیاز رہا

درد کا مزا ہوتا درد گر سوا ہوتا درد گر سوا ہوتا درد کی دوا ہوتا
تو جو اے تغافل خو مائلِ جفا ہوتا کیوں ترا مریضِ غم زیست سے خفا ہوتا
عزم گر قوی ہوتا رہروِ محبت کا اس کا رہبر منزل تیرا نقشِ پا ہوتا
ہجر گرچہ مشکل ہے ہم گوارا کر لیتے وصل گر نہ تھا منظور تم نے کہہ دیا ہوتا
دل ہی خود تھا آمادہ زخمِ عشق کھانے پر آپ کی نظر کا تیر کس طرح خطا ہوتا
تھی جو دل کو بیتابی یہ بھی سادہ لوحی تھی وعدہ آپ کا تھا وہ کس طرح وفا ہوتا
حال ہم کہیں کس سے کس کو کس کی پروا ہے کوئی ہم زباں ہوتا کوئی آشنا ہوتا
تیرا غم ہے وہ نعمت جان جس کی قیمت ہے کشتۂ جفا سے کیا شکوۂ جفا ہوتا
موت کے حوالے کیوں آپ نے کیا مجھ کو آپ کا فدائی تھا آپ پر فدا ہوتا

بندۂ محبت ہیں مُدّعا محبت ہے
ہم سے کس طرح وحشت ترکِ مدعا ہوتا

وہ رہرو جس کو لطفِ سعیِ بے حاصل نہیں ہوتا نشاں منزل کا اُس کو بر سرِ منزل نہیں ملتا
عنایت کی نظر دیکھی نہ آثارِ کرم پائے پھر آخر کس لیے تیرا مزاج اے دل نہیں ملتا
نہ کیوں خوش ہوں کہ بڑھ جائے گا لطفِ دشتِ پیمائی کوئی رہبر کہ جو ہو واقفِ منزل نہیں ملتا
نتیجہ تو نے دیکھا شمعِ محفل سرد مہری کا کہ اک پروانہ بہرِ گرمیِ محفل نہیں ملتا
یہ بحرِ غم میں طغیانی کا باعث کیا ہوا یارب کہ میری کشتیِ امید کو ساحل نہیں ملتا
نہیں کچھ ناخنِ تدبیر کی تقدیر سے چلتی سہارا کوئی بہرِ عقدۂ مشکل نہیں ملتا

توقع مجھ کو ہمدردی کی آخر کس سے ہو وحشت
یہاں تو ایک بھی دل درد کے قابل نہیں ملتا

کسی پر یہ وجودِ کالعدم ہو بار کیا میرا نہ کوئی التجا میری نہ کوئی مُدّعا میرا
نہ پائی داد کچھ آوارگی کی تیرے وحشی نے نہ پوچھا ایک دن تو نے کہاں ہے مبتلا میرا
کبھی صورت نہ نکلی کوئی میری باریابی کی ہوا گر تذکرہ محفل میں تیری بارہا میرا
نوائے درد تمہیدِ شکستِ سازِ دل نکلی نشانِ انتہا دیتا ہے رنگِ ابتدا میرا
وہ کہتے ہیں کہ ناواقف ہیں جو تنقید کرتے ہیں ادا میری بلا ہو ناز ٹھہرے فتنہ زا تیرا
نہ کہنے کی مجھے عادت نہ سننا خلق کا شیوہ کوئی جانے تو کیا جانے کہ ہے احوال کیا میرا
یہ رنگِ کس مپُرسی حوصلہ فرسا نہ ہو کیوں کر نہ واقف کوئی مجھ سے اور نہ کوئی آشنا میرا
رہے جو زیرِ لب فریاد پھر اس کی شکایت کیا ترے ڈر سے ہوا کرتا ہے نالہ نے صدا میرا

فضائے شعر کو پاتا ہوں اب نا آشنا وحشت
نہ کوئی ہم زباں میرا نہ کوئی ہم نوا میرا

ہم اپنی زندگی اپنے لیے دشوار کرتے ہیں عبارت مختصر یہ ہے کہ تم کو پیار کرتے ہیں
لبِ خاموش کو چشمک ہے آہنگِ تکلم سے کہ دیکھیں اس طرح عرضِ مطلب دشوار کرتے ہیں
ادائے آشنا ہے معنیٔ بیگانہ سے پیہم ہمارے شعر شرحِ گفتگوئے یار کرتے ہیں
کبھی برقِ تجلّی سے کسی کی جان لیتے ہیں کسی کو وہ ہلاکِ حسرتِ دیدار کرتے ہیں
زمانہ ناموافق ، نفس سرکش ، بخت برگشتہ نہ کرنا چاہیں بھی جو کام ہم ناچار کرتے ہیں
تمھیں سے دستگیری ہو تو ہو مجبورِ الفت کی کہیں ہم کس طرح تم سے کہ تم کو پیار کرتے ہیں

ہماری شاعری اب دل لگی سی رہ گئی وحشت
کہ کچھ کہہ لیتے ہیں احباب جب اصرار کرتے ہیں

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں
یہ کیا ہجومِ تمنا ہے خیر ہو یارب ہم ان سے ڈرتے نہیں اپنے دل سے ڈرتے ہیں
تری نظر کو نہیں بنتی ہے بے جواب دیے لبِ خموش کچھ ایسا سوال کرتے ہیں
دلیلِ پستیِ ہمت ہماری ظاہر ہے شکایتِ ستمِ روزگار کرتے ہیں
دکھائیں کیوں نہ وہ اندازِ حسن میں جدّت کہ فنِ عشق میں ہم اجتہاد کرتے ہیں
وہ ہنس کے کہتے تھے آج اپنے ملنے والوں سے
سُنا ہے حضرتِ وحشت بھی ہم پہ مرتے ہیں

دل کیا لگائیں گے سمن و یاسمن سے ہم واقف ہیں خوب رازِ بہارِ چمن سے ہم
اک یادِ عیش جس پہ ہوں قرباں ہزار عیش لے کر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم
سیرِ چمن کو نکلے تھے تفریح کے لیے افسردہ اور ہو کے پھرے ہیں چمن سے ہم
بہتر یہی ہے اپنا سمجھ لیں اسے وطن اب جائیں جس طرف کو نکل کر چمن سے ہم
پابندیِ رسوم کو سمجھا ہے بندگی زُنّار چھین لیں گے ابھی برہمن سے ہم
ہم کو بھی اپنے رنگِ طبیعت پہ ناز ہے لیتے ہیں نوک کی جو ترے بانکپن سے ہم
کیا رنگ انتقامِ خزاں کا ہو دیکھیے ڈرنے لگے ہیں جوشِ بہارِ چمن سے ہم
محرومیوں کو بھول گئے ذوقِ عیش میں پیمانہ پا کے ساقیِ پیماں شکن سے ہم
طرزِ جدید میں ہے وہی شیوۂ قدیم بھرتے ہیں جامِ نو کو شرابِ کہن سے ہم
ثابت ہوا ہوس تھی ہوائے گلِ مراد لے کر چلے ہیں داغِ ندامت چمن سے ہم
وحشت وہ عہدِ شوق تجھے یاد ہے کہ جب
رہتے تھے مستِ لذتِ شعر و سخن میں ہم

نہ مجھ کو امید ہے کسی سے نہ مجھ کو اندیشہ ہے کسی کا مزے سے اپنی گزر رہی ہے بھلا ہو اس بے تعلقی کا
روش زمانے کی دیکھتا ہوں خوشی ہو تو کس طرح ہو وہی مرے رونے کا محل ہے محل جو لوگوں کی ہے ہنسی کا
اگر کبھی کوئی کام کرنا تو مجھ کو ڈنکے کی چوٹ کرنا نہیں کوئی بات راز میری، یہ راز ہے میری زندگی کا
نصیحتِ ترکِ عشق اس کو ہے شیوہ جس کا وفا شعاری کوئی یہ احباب سے تو پوچھے یہ کون موقع ہے دل لگی کا

مشاعروں میں غزل سرائی نہیں مجھے اب پسند وحشت
نئے ہیں انداز شاعروں کے بدل گیا رنگ شاعری کا

دل کے کہنے پہ چلوں عقل کا کہنا نہ کروں میں اسی سوچ میں ہوں کیا کروں اور کیا نہ کروں
زندگی اپنی کسی طرح بسر کرنا ہے کیا کروں آہ اگر تیری تمنا نہ کروں
مجلسِ وعظ میں کیا میری ضرورت ناصح گھر میں بیٹھا ہوا شغلِ مئے مینا نہ کروں
مست ہے حال میں دل، بے خبر مستقبل سے سوچتا ہوں اُسے ہشیار کروں یا نہ کروں

کس طرح حسنِ زباں کی ہو ترقی وحشت
میں اگر خدمتِ اردوئے معلّیٰ نہ کروں

ہنسنے کی عرضِ حال پہ میرے سہی نہیں دل کی لگی کا ذکر ہے یہ دل لگی نہیں
اُن کے نگاہِ لطف پہ ہم ناز کیا کریں دولت کا سایہ سر پہ کبھی ہے کبھی نہیں
میرے دلِ شکستہ میں ناگفتہ رہ گئی وہ داستانِ غم جو کسی نے سُنی نہیں
کیا کیجیے کہ ہوتی ہے آنکھوں سے آشکار وہ بات جو زبان نے اب تک کہی نہیں

ہر چند طبعِ شعر ازل سے مجھے ملی
وحشت مرا شعار مگر شاعری نہیں

وصل کی آرزو سے کام نہیں — پختہ مغزانِ عشق خام نہیں
تلخیِ یاس کی ہے یہ تمہید — بادۂ آرزو کا جام نہیں
کیوں کریں شکوۂ تہی دستی — مئے و مینا نہیں کہ جام نہیں
منتظر دام ہی کا ہے وہ صید — جو ہنوز اُس کے زیرِ دام نہیں
پوچھ دیکھ اپنے ہی تغافل سے — میرا سودائے عشق خام نہیں
قابلِ اعتراض ہوتی ہے — خاص کر وہ روش جو عام نہیں

سُن کے بولے کلام وحشت کا
اس کی خوبی میں کچھ کلام نہیں

جو حق پوچھو کتابِ آرزو کا حرف باطل ہوں — مٹا دیں کیوں نہ وہ مجھ کو مٹا دینے کے قابل ہوں
خفا تم جُرمِ اُلفت پر، خجل میں جرمِ اُلفت سے — نہ تم ملنے پر آمادہ نہ میں ملنے کے قابل ہوں
گرہ ان ابروؤں کی کب مجھے مایوس کرتی ہے — تبسم تیرا کہتا ہے کلیدِ عقدۂ دل ہوں
مری حیرت نتیجہ ہے تری رنگیں ادائی کا — تری محفل میں اک تصویر ہوں اور زیبِ محفل ہوں
خیالِ خام سے ہے پختگی بنیاد الفت کی — سراپا شوق، ممنونِ فریبِ سعیِ باطل ہوں
نظر جس نے اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو مری جانب — عجب مشکل میں ہوں کیسے کہوں میں اس کا کامل ہوں
جرس نالاں ہے اپنے نالۂ پیہم سے کہتا ہے — خدا جانے میں کس کمبخت کا ٹوٹا ہوا دل ہوں
تبسم ریز لب ان سے مکر جانے کو کہتا ہے — نگاہِ ناز لیکن صاف کہتی ہے کہ قاتل ہے
سراپا آرزو تھا ایک دن اس کی سزا یہ ہے — مرقعِ یاس کا ہوں داستانِ حسرتِ دل ہوں

غزل اپنی کہاں ہے قابلِ بزمِ طرب وحشت
کہ ہر ہر شعر کہتا ہے صدائے گریۂ دل ہوں

شکوہ بے جا ہے محبت کا بجا کہتے ہیں — اس کو کیوں درد کہیں جس کو دوا کہتے ہیں
سادہ دل کتنے ہیں اربابِ محبت سے ہے — کہ ترے عشوۂ پنہاں کو حیا کہتے ہیں
کشتۂ خنجرِ تسلیم ہیں ہم، ہم سے پوچھ — کچھ تو دیکھا ہے فنا کو جو بقا کہتے ہیں
کہتے ہیں میری جفا تیرے لیے ہے مخصوص — اور پھر کس کو خدا جانے وفا کہتے ہیں
اپنے مشتاق سے منھ پھیر کے جانے والے — یہ ادا ہے تو بتا کس کو قضا کہتے ہیں
بے زبانی ہے زباں عرضِ تمنا کے لیے — جاننے والے خموشی کو صدا کہتے ہیں

کچھ خبر بھی ہے تجھے وحشتِ شیریں گفتار
کہ تجھے لوگ امام الشعرا کہتے ہیں

لب پر دعا تھی جب نہیں دیکھا عتاب میں — کچھ اور مجھ سے بن نہ پڑا اضطراب میں
اب تو خیالِ خواب مجھے خواب ہوگیا — اتنا خیال ہے کہ وہ آئے تھے خواب میں
یہ نشہ یہ سُرور یہ بد مستیاں یہ کیف — کیا عکسِ روئے یار ہے جامِ شراب میں
اے زاہد اپنے نفس پہ اتنا بھی جبر کیا — فکرِ ثواب نے تجھے ڈالا عذاب میں
روزِ حساب ڈر ہو مجھے کیا حساب کا — میرا حساب کیوں ہو میں ہوں کس حساب میں
تحریرِ خط کا سلسلہ تا منقطع نہ ہو — کچھ تو رہے سوال کا پہلو جواب میں

وحشت مرا عقیدۂ غالب پہ ہے عمل
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بو تراب میں

کچھ ابر میں مستی ہے تو کچھ موجِ ہوا میں
کیفیتِ میخانہ ہے گلشن کی فضا میں

ہر چند کہ اک لطف ہے شوخی کی ادا میں
وہ بات ہے کچھ اور جو ہوتی ہے حیا میں

ہے کشورِ غم اشک سے اور آہ سے آباد
پھولے نہ پھلے ہم مگر اِس آب و ہوا میں

نومیدیِ خاطر سے مری صاف عیاں ہے
وہ راز کہ پنہاں ہے ترے عہدِ وفا میں

ہے قوتِ بازو میں تری رازِ سعادت
تو ڈھونڈتا پھرتا ہے اُسے بالِ ہما میں

انصاف طلب ہے کہ شکایت میں بھی اک لطف
ہر چند مزے آتے ہیں تسلیم و رضا میں

جو درد ہے دل میں وہی قانونِ اثر میں
ورنہ کئی تاثیر نہیں نَے کی صدا میں

دل والے ہی کچھ جانتے ہیں پوچھو انھیں سے
جو مرتبہ وحشت کا ہے بزمِ شعرا میں

دل کا گلہ کروں کہ گلہ آپ کا کروں
ملزم ہے ان میں کون میں کیا فیصلہ کروں

تا زندگی امیدِ رہائی نہیں رہی
ہوں دامِ آرزو کا گرفتار کیا کروں

قطعِ امید میرے لیے ہوگی جاں گسل
تیرا خیال اگر نہ کروں میں تو کیا کروں

جب ناصحو! علاج ہی آیا نہ کچھ تمھیں
تم صبر کو کہا کرو اور میں سُنا کروں

اک دن مجھے بھی اوجِ ترقی کی تھی ہوس
مجبور کر دیا ہے زمانے نے کیا کروں

جب عشق کو رکھا ہے رَوا اپنے واسطے
میں کیوں شکایتِ ستمِ ناروا کروں

امید کیا رکھوں کسی بیگانہ خُو سے میں
اب رفتہ رفتہ دل کو ہی یاس آشنا کروں

وحشت غزل کچھ آج تو پھیکی ہی سی رہی
کیوں کر کروں تو اضعِ احباب کیا کروں

طرزِ غفلت نہیں یا شیوۂ بیداد نہیں　　آپ کا کونسا انداز مجھے یاد نہیں
میرے دل کی اُنھیں تھوڑی سی خبر ہو جاتی　　اس قدر بھی اثرِ نالہ و فریاد نہیں
لطف آتا ہے مجھے وعدوں کا کرتے ہوئے ذکر　　جب وہ کہتے ہیں ترے سر کی قسم یاد نہیں
فائدہ بحث سے کیا جاؤ ہیں دونوں جھوٹے　　ہم ستم دیدہ نہیں تم ستم ایجاد نہیں
ہے قفس میں بھی میسر مجھے پروازِ خیال　　روح آزاد ہے اپنی جو تن آزاد نہیں
نہ وفا میں نے کبھی کی نہ جفا آپ نے کی　　مجھ کو بھی یاد نہیں آپ کو بھی یاد نہیں
ہوسِ عیش ہے اُس کو نہ ہوائے عشرت　　جو کبھی شاد ہو وہ آپ کا ناشاد نہیں

وحشت اک فکرِ عبث ہے ہوسِ آزادی
دہر وہ دام ہے جس سے کوئی آزاد نہیں

لطفِ نہاں سے جب جب وہ مسکرادیے ہیں　　میں نے بھی زخم دل کے ان کو دکھادیے ہیں
کچھ حرفِ آرزو تھا ، کچھ یادِ عیشِ رفتہ　　جتنے تھے نقش دل میں ہم نے مٹادیے ہیں
فرطِ غم والم سے جب دل ہوا ہے گریاں　　اس نے عنایتوں کے دریا بہادیے ہیں
دیکھے ہیں تیرے تیور دھوکا نہ کھائیں گے اب　　اٹھتے تھے ولولے کچھ ہم نے دبا دیے ہیں
اس دلنشیں ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے　　جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مُسکرادیے ہیں
کچھ شوخ کردیا ہے چھیڑوں سے ہم نے تم کو　　کچھ حوصلے ہمارے تم نے بڑھادیے ہیں
کیا کوئی تجھ کو دیکھے پردہ اُٹھانے والے　　تو نے تجلیوں کے پردے گرادیے ہیں

کرتا ہوں وحشت ان سے عرضِ نیازِ پنہاں
اس کام کے طریقے دل نے بتادیے ہیں

بدل گیا ہے زمانہ وہ روزگار کہاں
نگاہ ڈھونڈتی ہے جس کو وہ بہار کہاں

بیاضِ صبح کہاں رنگِ روئے یار کہاں
سوادِ شام کہاں زلفِ تاب دار کہاں

وصال میں ہے وہی حال جو فراق میں تھا
جو بیقرار ہو تیرا اسے قرار کہاں

یہ سچ ہے آپ بھی سچے ہیں وعدہ بھی سچا
میں انتظار کروں تابِ انتظار کہاں

تمھارے وعدے پہ جینے کو میں تو ہوں تیار
مگر بتاؤ کہ جینے کا اعتبار کہاں

امنگ اٹھی ہے کیسی بہار سے پہلے
نہ کھا فریب تو اے دل ابھی بہار کہاں

گلی میں اس کی تجھے پوچھتا ہے کون اے دل
خدا کے واسطے جاتا ہے بار بار کہاں

مجھے چمن سے غرض کیا، بہار سے کیا کام
نسیمِ صبح تو آئی ہے ، بوئے یار کہاں

بغیر درد نہیں لطفِ زندگی وحشت
دل و جگر تو ہیں بیتاب ، تیرِ یار کہاں

عشق میں جب نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں
کیوں نہ میں خوش ہوں کہ میرا مدعا کچھ بھی نہیں

گونجتے رہتے ہیں نغمے جس کی بزمِ ناز میں
اُس کے آگے نالۂ دل کی صدا کچھ بھی نہیں

یہ تو ممکن ہے کہ برتوں اُن سے میں رسمِ وفا
میں نے مانا اُن سے امیدِ وفا کچھ بھی نہیں

شکر کرتا ہوں کہ فکرِ چارہ سے آزاد ہوں
درد وہ دل کو ملا جس کی دوا کچھ بھی نہیں

خود مجھی کو صبر کی طاقت نہیں ہے عشق میں
ورنہ سچ پوچھو تو ظالم کی جفا کچھ بھی نہیں

شکر کرتا ہوں کہ کچھ تو ہے تجھے میرا خیال
جور ہو بیداد ہو ، اس کا گِلا کچھ بھی نہیں

کیا کہوں کہتا ہے اب دورِ جدید شاعری
ترک کر وحشت غزل اس میں مزا کچھ بھی نہیں

پیدا ہوا کچھ ایسا تلاطم خیال میں   شبہائے ہجر کٹ گئیں شوقِ وصال میں
بیتابیاں ادھر تو ادھر بے نیازیاں   تھیں دقتیں ہمارے لیے عرضِ حال میں
میرے لبِ خموش سے وہ مطمئن نہ ہوں   مشتاق ہے نگاہِ تمنا سوال میں
شکرِ خدا کہ میں نہیں اتنا بھی نامراد   شرکت کسی کی ہے مری بزمِ خیال میں
وحشت سخن سے اب مجھے باقی نہیں لگاؤ
آتی ہے شرم صحبتِ اہلِ کمال میں

جھوم رہا ہوں بیٹھ کر وادیِ کوہسار میں   جاؤں چمن کی سیر کو، ہوش کہاں بہار میں
ہوگئی زندگی عذاب، کیسی کشاکش آ پڑی   شوقِ سبک خرام میں، عقلِ گراں وقار میں
خوابِ شباب خوب تھا، کھل گئی ناحق اپنی آنکھ   دشمنِ عیش ہوگیا بیمِ خزاں بہار میں
دل ہے تکلف آشنا، لطف ہے جب کہ دیکھیے   بادۂ لعل فام کو ساغرِ زرنگار میں
مستیِ ذوقِ شعر سے بزم کی بزم ہے خراب
کوئی تو بات ہے ضرور وحشتِ سحر کار میں

ہوسِ سود میں سودائے زیاں کرتا ہوں   جو مجھے چاہیے کرنا وہ کہاں کرتا ہوں
دل پھنکا جاتا ہے پر آہ کہاں کرتا ہوں   کس قدر پاس ترا سوزِ نہاں کرتا ہوں
حالِ دل کچھ تو نگاہوں سے عیاں کرتا ہوں   اور کچھ طرزِ خموشی سے بیاں کرتا ہوں
عقل حیران ہے خود اپنی کہ میں کیا کیا کچھ   دوستی میں تری اے دشمنِ جاں کرتا ہوں
شغلِ مے سے مجھے کیا کام، مگر جب ناصح   پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہاں کرتا ہوں
لطف آجاتا ہے اربابِ سخن کو وحشت
جب کبھی تذکرۂ حسنِ بتاں کرتا ہوں

کسی طرح جان تو کٹ رہے ہیں فریبِ امید کھا رہا ہوں ہزار ہا نقشِ آرزو کے بنا رہا ہوں ، مٹا رہا ہوں
وفا مری معتبر ہے کتنی جفا وہ کر سکتے ہیں کہاں تک جو وہ مجھے آزما رہے ہیں تو میں انھیں آزما رہا ہوں
کسی کی محفل کا نغمۂ نے محرکِ ناله و فغاں ہے فسانۂ عیش سُن رہا ہوں فسانۂ غم سُنا رہا ہوں
زمانہ بھی مجھ سے ناموافق، میں آپ بھی دشمنِ سلامت تعجب اس کا بوجھ کیوں کر میں زندگی کا اٹھا رہا ہوں
نہ ہو مجھے جستجوئے منزل مگر ہے منزل مری طلب میں کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف کو تو جا رہا ہوں
یہی تو ہے نفع کوششوں کا کہ کام سارے بگڑ رہے ہیں یہی تو ہے فائدہ ہوس کا کہ اشکِ حسرت بہا رہا ہوں

خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ وحشت
وہ جتنی الفت گھٹا رہے ہیں اُسی قدر میں بڑھا رہا ہوں

مجھے یوں مشکل آسانی نظر آتی ہے مشکل میں کہ اُس کو یاد آجاؤں گا جس کی یاد ہے دل میں
وہ دل ہی اب نہیں جس کو ہو لطفِ راحتِ منزل کچھ ایسی سختیاں میں جھیل کر پہنچا ہوں منزل میں
پسِ جورِ تغافل یہ عنایت کی نظر کیسی ابھی تک تم کو کچھ شک ہے مری بربادیِ دل میں
کہا تو ہے کچھ اپنا حال میں نے آپ سے لیکن وہی سننے کے قابل تھا جو حصہ رہ گیا دل میں
حریفِ قعرِ دریا ہے بلندی میری ہمت کی نہیں میرے لیے کوئی کشش آغوشِ ساحل میں
ڈبویا ہے مجھے امید ہی کی سادہ لوحی نے وہی حسرت بنا ہے پہلے جو ارمان تھا دل میں
بس اک شکلِ تقاضائے جنوں ہے جستجو میری مجھے شوقِ سفر کب چین لینے دے گا منزل میں
ہوا سب فوت اپنی منزلِ مقصود کا مقصد طلب کی لذتیں جاتی رہیں جب فکرِ منزل میں

ضرورت روشنی کی تھی وہ حاصل ہے مجھے وحشت
کہ اک مدت سے جلتا ہے چراغِ آرزو دل میں

جب حریفِ محفل آرائی ترا کوئی نہیں پھر جہاں تو ہے وہاں تیرے سوا کوئی نہیں
تیرا غمزہ کس قدر بیگانگی آموز ہے تیری محفل میں کسی کا آشنا کوئی نہیں
بیخودیِ عشق نے مجھ کو دیا درسِ خودی میں ہی میں ہوں ہر طرف، میرے سوا کوئی نہیں
تھیں بیاں کرنے کے قابل دردِ دل کی لذتیں پر کہوں کس سے یہاں درد آشنا کوئی نہیں
راہ پیمائی سے مطلب ہے، نہ کر منزل کی فکر تو چلا چل، کیا ہوا جو رہنما کوئی نہیں
تو کسی کا ہو کے دیکھ اے شکوہ سنجِ روزگار کیوں یہ کہتا ہے کہ دنیا میں مرا کوئی نہیں

ہمصفیر اپنا طلب کرتا ہے ذوقِ شعر سے
کیوں حریفِ وحشتِ رنگیں نوا کوئی نہیں

نہ منزل کا پتہ ہم کو نہ مقصد کی خبر ہم کو ہوائے کوئے جاناں لے چلی آخر کدھر ہم کو
خجل تو کر چکے ہیں نالہ ہائے بے اثر ہم کو کہیں بے آبرو تو بھی نہ کرنا چشمِ تر ہم کو
ہر اک موقع پہ پاسِ خاطرِ احباب مشکل ہے مروّت نے دیا ہے مفت کا یہ دردِ سر ہم کو
گلستانِ ازل سے کس کا سودا سر میں لائے تھے کہ بازارِ جہاں میں جستجو تھی عمر بھر ہم کو
مثالِ ابر اڈے ہی چلے آتے ہیں اشک اپنے ڈراتی رہتی ہے گو آپ کی برقِ نظر ہم کو
ہمارے عقدۂ مشکل کے حل ہونے کا ایما ہے پس از تاریکیِ شب جلوۂ نورِ سحر ہم کو

نہیں ڈرتے ہیں ہم وحشت جو واعظ کے ڈرانے سے
بھروسا ہے کچھ ایسا ہی کسی کے قول پر ہم کو

فراق کا الم نہ ہو، وصال کی خوشی نہ ہو ہے وہ بھی کوئی زندگی کہ جس میں زندگی نہ ہو
میں ناحق اپنے دل کو کیوں امید آشنا کروں جب ایسا وعدہ تم کرو کہ جو کبھی وفا نہ ہو
نہاں ہے دل میں عشق کا وہ راز جو کبھی عیاں بطرزِ گفتگو نہ ہو بشکلِ خامشی نہ ہو
جو ذوقِ درد ہے تجھے تو دل کو خستہ تر بنا گداز کا مزا کہاں اگر شکستگی نہ ہو

نہ ہو تو وحشتِ حزیں امیدِ عیش کے قریں
ہوائے زندگی کہیں بلائے زندگی نہ ہو

کہتے ہو اب ترے مظلوم پہ بیداد نہ ہو ستم ایجاد ہو ، کیسے ستم ایجاد نہ ہو؟
نہیں، پیمانِ وفا تم نے نہیں باندھا تھا وہ فسانہ ہی غلط ہے جو تمھیں یاد نہ ہو
تم نے دل کو مرے کچھ ایسا کیا ہے ناشاد شاد کرنا بھی جواب چاہو تو یہ شاد نہ ہو
جو گرفتار تمھارا ہے وہی ہے آزاد جس کو آزاد کرو تم کبھی آزاد نہ ہو
میرا مقصد کہ وہ خوش ہوں مری خاموشی سے ان کو اندیشہ کہ یہ بھی کوئی فریاد نہ ہو
میں نہ بھولوں گا غمِ عشق کا احساں وحشت
ان کو پیمانِ محبت جو نہیں یاد نہ ہو

مانعِ ذکرِ مروّت ہے مروّت مجھ کو کہ خجل ہوگے جو تم ہوگی ندامت مجھ کو
مدّعا ہے جو محبت سے محبت مجھ کو درد ہے میری دوا رنج ہے راحت مجھ کو
ماضی و حال میں کیسا ہے تعلق یارب سبب رنج ہے گذری ہوئی راحت مجھ کو
آپ اچھے ہیں مگر ایسے بھی تیور کیا ہیں کہ نہ ہو عرضِ تمنا ہی کی جرأت مجھ کو
وحشت اس جلسے میں ہیں حضرتِ ناطق جو شریک
خوب موقع ہے پئے عرضِ عقیدت مجھ کو

یہ کیوں کہوں کہ سوزِ دل اپنا عیاں نہ ہو ہاں التزامِ نالۂ آہ و فغاں نہ ہو
لازم ہے کارواں کو ، رہے آپ مستعد شرمندۂ صدا جرسِ کارواں نہ ہو
درد آشنا دلوں کے نہیں لائقِ قبول جب تک کہ کوئی درد بھری داستاں نہ ہو
ڈر ہے کہ کھل نہ جائے کسی کی جفا کا راز اے دل شکایتِ ستمِ آسماں نہ ہو
جب نامرادیوں میں گزاری ہے زندگی بہتر یہ ہے کہ مجھ پہ تو اب مہرباں نہ ہو
مجبور ہو کے میں نے لگائی لبوں پہ مہر کیا لطفِ گفتگو جو کوئی ہم زباں نہ ہو
وحشت مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر
جس میں کہ حسنِ معنی و لطفِ زباں نہ ہو

کیوں پیش و پس تجھے نگہِ فتنہ کار ہو ہوتا ہے اس میں کوئی اگر بے قرار ہو
تو بھی مری طرح نہ کہیں بے قرار ہو دل کو شکار کر کے نہ دل کا شکار ہو
ہونے لگا وہ کیوں غمِ فرقت کا شکوہ سنج جو دل ترے جمال کا آئینہ دار ہو
کیا جانے دردِ دل کوئی اُس عندلیب کا جس کو پیامِ مرگ پیامِ بہار ہو
وحشت تبسم اُن کا یہ کہتا ہے مجھ سے صاف
کیا تم بھی میرے وصل کے امیدوار ہو

ہیں جبیں پہ میری رقصاں جو سجودِ والہانہ تو عیاں ہے یہ کہ مقصد ہے کسی کا آستانہ
مجھے بے حسی سے حاصل ہوئی دولتِ قناعت نہ شکایتِ قفس ہے نہ خیالِ آشیانہ
ہے زمانے سے ابھی تک مجھے چشمِ سازگاری نہ ہوئی خبر بھی اس کی کہ بدل گیا زمانہ
وہ جنونِ عشق میرا کہ جو بن گیا مصیبت وہ فسونِ حسن تیرا کہ جو ہوگیا فسانہ
ہدفِ خدنگِ حسرت اُسے ہے جہاں میں ہونا نہ ہوا ہو جو کوئی دل ترے تیر کا نشانہ
تجھے یادِ عیشِ رفتہ نہیں چاہیے اب اے دل وہ پلٹ کے آئے گا کیا جو گزر گیا زمانہ
کوئی میرے دل سے پوچھے کوئی ان کے دل سے پوچھے وہ ادائے دلبرانہ یہ نگاہِ عاجزانہ
مجھے شوق لے چلا ہے یہ میں خوب جانتا ہوں کہ جہاں نہ ہو رسائی وہ ہے تیرا آستانہ
ہوئی خود بخود ارادت ہوئی خود بخود عقیدت ہے محرکِ غلامی وہ ادائے صاحبانہ
مرے دل نے دے دکھی ہے مجھے دولتِ حضوری ہے اگرچہ آشنائی مری ان کی غائبانہ
تری شاعری نے وحشت یہ مچائی دھوم کیسی
کہ زمانہ کہہ رہا ہے تجھے غالبِ زمانہ

محفلِ غیر میں کیا اپنے کو رُسوا کرتے آپ سُنتے تو ہم اظہارِ تمنا کرتے
مصلحت تھی، نہ کہا دل سے جو اُن کا احوال وہ اگر سُن کے بگڑ جاتے تو ہم کیا کرتے
طور کیا ہم نے زمانے کے نہیں دیکھے تھے کہ کسی بات کی دنیا میں تمنا کرتے
مطمئن رہنے نہ دیتی ہمیں بیتابیِ دل ہم ترے قول پہ ہر چند بھروسا کرتے
بے حجابانہ چلے آتے کبھی تم جو ادھر ہم کچھ اس طرح تھے محجوب کہ پروا کرتے

بزمِ اغیار میں معذور نہ تھے وہ وحشت
بات اگر کہہ نہیں سکتے تھے، اشارا کرتے

دل کی تسکین کا پیدا کوئی عنواں کردے اے نہیں والے کبھی بھولے سے تو ہاں کردے
کیا یہ ممکن نہیں تجھ سے چمن آرائے جمال کہ کسی کو گلِ مقصود بداماں کردے
تشنہ کامی مری توہین ہے تیری ساقی میرے دل کو بھی کبھی میکدہ ساماں کردے
ہوش والوں کو ہوس ہے ترے نظارے کی اپنی زلفوں کو ذرا رخ پہ پریشاں کردے
احتیاط اتنی بھی اچھی نہیں اے قائلِ ضبط ہاتھ کو اپنے کبھی وقفِ گریباں کردے
عشق کا حسن سے کچھ کم ہے فسوں سازی میں تجھ سے کافر کو بھی چاہے تو مسلماں کردے
تا بکے شکلِ مجازی میں تری جلوہ گری اس حقیقت کو جو پوشیدہ ہے عریاں کردے
دیکھنا یہ ہے کہ ہوتا ہے کسے دین عزیز اک اشارہ تو وہ غارت گرِ ایماں کردے
عیشِ کامل کی اگر تجھ کو ہوس ہے اے دل دیدۂ شوق کو محوِ رخِ جاناں کردے
کیوں ترا کام ادھورا رہے اے دستِ جنوں چاکِ دامن کو اگر تا بہ گریباں کردے
منہ دکھاؤں میں اُسے کیا جو بایں ذوقِ وفا اپنا معیارِ وفا مجھ کو پشیماں کردے
شوق بیتاب ہے اظہارِ تمنا کے لیے ہم کو رُسوا نہ ہمارا دلِ ناداں کردے
مجھ کو مشکل میں مزا آتا ہے مشکل یہ ہے ہم کو رُسوا نہ ہمارا دلِ ناداں کردے

تا ترے عیش کی تصویر مکمل ہو جائے
اپنی محفل میں تو وحشت کو غزل خواں کردے

شرمندہ کیا جوہرِ بالغ نظری نے — اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے
صد شکر کسی کا نہیں محتاج کرم میں — احسان کیا ہے تری بیداد گری نے
محتاج تھی آئینہ کی ، تصویر سی صورت — تصویر بنایا مجھے محفل میں کسی نے
گل ہنستے ہیں غنچے بھی ہیں لبریزِ تبسم — کیا اُن سے کہا جاکے نسیمِ سحری نے
مایوس نہ کردیں کہیں ان کی نگہِ گرم — امید دلائی ہے مجھے سادہ دلی نے
محنت ہی پہ موقوف ہے آسائشِ گیتی — کھوئی مری راحت مری راحت طلبی نے

وحشت میں نگاہوں کے تجسس سے ہوں آزاد
احسان کیا مجھ پہ مری بے ہنری نے

آپ اپنا روئے زیبا دیکھیے — یا مجھے محوِ تماشا دیکھیے
شوق کو ہنگامہ آرا دیکھیے — کاروبارِ حسرت افزا دیکھیے
رنگِ گلزارِ تمنا دیکھیے — دلکشی ہائے تماشا دیکھیے
حسن ہے سو رنگ میں تحسیں طلب — دیدۂ حیراں سے کیا کیا دیکھیے
حسرتِ نظارہ میں ہے لب خاموش ہیں — شیوۂ عرضِ تمنا دیکھیے
ہائے رے ذوقِ تماشائے جمال — خود تماشا ہوں تماشا دیکھیے
آپ نے پھر کر نہ دیکھا اس طرف — ہوگیا خونِ تمنا دیکھیے
اُٹھتی ہیں نظریں مری کس شوق سے — مجھ کو ہنگامِ تماشا دیکھیے
حسرتوں کا ہائے رے دل میں ہجوم — آرزوؤں کا نتیجہ دیکھیے
سجدے کو بیتاب ہوتی ہے جبیں — شوخیِ نقشِ کفِ پا دیکھیے

کہتے ہیں کرلیں گے اُس کافر کو رام
حضرتِ وحشت کا دعویٰ دیکھیے

جو تجھ سے شورِ تبسم ذرا کمی ہوگی
ہمارے زخمِ جگر کی بڑی ہنسی ہوگی

رہا نہ ہوگا مرا شوقِ قتل بے تحسیں
زبانِ خنجرِ قاتل نے داد دی ہوگی

تری نگاہ تجسس بھی پا نہیں سکتی
اُس آرزو کو جو دل میں کہیں چھپی ہوگی

مرے تو دل میں وہی شوق ہے جو پہلے تھا
کچھ آپ ہی کی طبیعت بدل گئی ہوگی

بجھی دکھائی تو دیتی ہے آگ اُلفت کی
مگر وہ دل کے کسی گوشے میں دبی ہوگی

کوئی غزل میں غزل ہے یہ حضرتِ وحشت
خیال تھا کہ غزل آپ نے کہی ہوگی

خموشی میں مرے پنہاں مرے غم کی کہانی ہے
زبانِ قصۂ حسرت زبانِ بے زبانی ہے

اُدھر وہ کم نگاہی ہے اِدھر یہ بے زبانی ہے
ابھی محفوظ حسن و عشق کا رازِ نہانی ہے

ترے جلوے سے ہوں ساغر کشِ خمخانۂ حسرت
تری ایک ایک ادا بدمست صہبائے جوانی ہے

فریبِ امتحانِ عشق آخر کب تلک ظالم
ترے انداز سے اب دل کو کچھ کچھ بدگمانی ہے

تغافل کی ادا ہر چند ہے صبر آزما لیکن
نگاہِ بے محابا اک بلائے ناگہانی ہے

گرفتاری میں ہر دم دیکھتا ہوں خوابِ آزادی
قفس میں طاقتِ پرواز صرفِ پُرفشانی ہے

عجب کیا ہے ترے کوچے کی ہو کر خاک رہ جاؤں
کہ میں نے ایک مدت اس زمیں کی خاک چھانی ہے

اُٹھائے ہیں وہ صدمے جو اُٹھانے کے نہ قابل تھے
فراقِ یار میں جیتا ہوں میری سخت جانی ہے

مری افسردہ طبعی کا ہوا ہے خاص کر باعث
وہ احساسِ طرب جو عیشِ رفتہ کی نشانی ہے

ہمارے عقدۂ مشکل کو مژدہ ہے کشائش کا
کہ ان کی تیغِ ابرو کو خیالِ مہربانی ہے

ہمارے رشحے میں فارسی کی شان ہے وحشت
کہیں ترکیبِ عرفی ہے کہیں طرزِ فغانی ہے

محوِ حرم کہ زائرِ دیرِ بتاں رہے　　تیری ہی جستجو میں رہے ہم جہاں رہے
اے باغباں بس اک نفسِ گرم کی ہے دیر　　تیرا چمن رہے نہ سرا آشیاں رہے
رکھو نہ ہم پہ تہمتِ نظارۂ جمال　　تم آ کے بیٹھے بزم میں، پھر ہم کہاں رہے
ہم تو یہاں سے لے کے چلے اپنا آشیاں　　گلشن میں اب بہار رہے یا خزاں رہے
باز آیا جدو جہد سے میں سوچ کر مآل　　اک پَر شکستہ دام میں کیا پُر فشاں رہے
ایسی جو ہے تبسمِ پنہاں کی چھیڑ چھاڑ　　کیونکر جگر کا زخم جگر میں نہاں رہے
پیچیدگی سے پاک رکھ اپنے کلام کو
وحشت سخن میں چاہیے لطفِ زباں رہے

کرے نہ شوق سے کیوں نالۂ فغاں کوئی　　خوشی ہے اس کی کہ ہوتا ہے شادماں کوئی
وہ بات ہو کے رہے گی جو ہونے والی　　نہ چھیڑے اپنی مصیبت کی داستاں کوئی
الٰہی اس کا نتیجہ نہ ہو پشیمانی　　کسی کی بزم سے اٹھا ہے شادماں کوئی
جو کہیے کچھ تو وہ اپنی خطا ٹھہرتی ہے　　خموش رہیے تو ہوتا ہے بدگماں کوئی
عتاب کیوں ہے اگر لطف کا خیال نہیں　　سُبک بنا کے مجھے ہو نہ سرگراں کوئی
بہت سے رہ گئے ناگفتہ نکتہ ہائے لطیف
ملا نہ دہر میں وحشت کو ہم زباں کوئی

درد اک جہاں کا نالۂ مرغِ چمن میں ہے　　کیسا یہ دکھ غریب کو یارب وطن میں ہے
مرہم کا ذکر کس نے عداوت سے کر دیا　　یہ کیا نئی خلش مرے زخمِ کہن میں ہے
پھر لے گیا چمن میں اُسے حسنِ خود نما　　پھر اک بہارِ تازہ بہارِ چمن میں ہے
ہیں اہلِ انجمن کی جو بے التفاتیاں　　خلوت کا لطف مجھ کو تری انجمن میں ہے
وحشت کی خامشی بھی شکایت سے کم نہیں
رونق ہے انجمن کی اگر انجمن میں ہے

باز بھی آتے نہیں تم شیوۂ بیداد سے
کرتے ہو فریاد بھی میرے لبِ فریاد سے

بے خبر ہرگز نہیں وہ مقصدِ فریاد سے
داد دیتے ہیں مری فریاد کی بیداد سے

بے مزہ ہم کیوں ہوں زخمِ خنجرِ بیداد سے
تم نمک ریزی کرو شورِ مبارک باد سے

کام جو نکلا ہے زورِ بازوئے فرہاد سے
وہ نکلتا کیا فغان و نالہ و فریاد سے

کون کہتا ہے تلافی تم کرو بیداد کی
منہ نہ پھیرو کشتگانِ خنجرِ بیداد سے

آپ کی بیدادِ استغنا کا آخر کیا علاج
آپ تو آزردہ ہوتے ہیں مری فریاد سے

ولولے تھے شور انگیز، آرزوئیں جوش زن
داد پائی ہم نے وحشت خنجرِ بیداد سے

بہار آئی ہے آرائشِ چمن کے لیے
مری بھی طبع کو تحریک ہے سخن کے لیے

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

وطن میں آنکھ چراتے ہیں ہم سے اہلِ وطن
تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لیے

چمن کے دام سے جائیں گے ہم کہاں صیاد
قفس فضول ہے پروردۂ چمن کے لیے

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیِ چمن کے لیے

میں قیدِ رشک سے آزاد ہوں محبت میں
کہ تجھ کو شمع بنایا ہے انجمن کے لیے

برنگِ غنچہ کہ آمادۂ شگفتن ہو
ہے آفریدہ تبسم ترے دہن کے لیے

سوادِ دیدۂ دیدار ہو کو حل کر کے
بنا ہے سرمہ تری چشمِ سحر فن کے لیے

زبانِ اہلِ بصیرت پہ عرضِ حیرت ہے
سکوت داد ہے گویا مرے سخن کے لیے

قمر کے آنے سے محفل میں چار چاند لگے
سخن قمر کے لیے ہے قمر سخن کے لیے

فروغِ طبعِ خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لیے

ضبط کی کوشش ہے جانِ ناتواں مشکل میں ہے
کیوں عیاں ہو آنکھ سے وہ غم جو پنہاں دل میں ہے

داستانِ شوق کچھ لب پر ہے اور کچھ دل میں ہے
اے زباں دانِ تمنا تو بھی کس مشکل میں ہے

تم نے مشکل میں رکھا ہے دل کو دل مشکل میں ہے
حیف ہے اُس آرزو کمبخت پر جو دل میں ہے

جس سے چاہو پوچھ لو تم میرے سوزِ دل کا حال
شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے

اور ہوں گے وہ نکالیں گے جو دل کی آرزو
وہ تمنا جان ہے میری جو میرے دل میں ہے

عیشِ ہم بزمی ہے اک تہمت دلِ وارفتہ پر
اور ہی عالم میں ہے ہر چند اس محفل میں ہے

ہجر میں دل دیکھتا ہے خواب تیرے وصل کا
قعرِ دریا میں ہے اور نظارۂ ساحل میں ہے

عشقِ غارت گر نے شہ دی حُسنِ آفت خیز کو
شوقِ بسمل ہی سے کس بل بازوئے قاتل میں ہے

نغمۂ مطرب ہے عشقِ خانہ ویراں ساز کو
وہ نوائے درد جو جو مضمر شکستِ دل میں ہے

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

خود تجھے آجائے گا عاشق نوازی کا خیال
تیرا رہرو کیوں خیالِ دوریِ منزل میں ہے

اپنے ذوقِ قتل کی بسمل کہاں پاتا ہے داد
دیکھیے جس کو ثنائے بازوئے قاتل میں ہے

کیا غرض جو اُن کو پوچھیں تاب کیا جو ہم کہیں
دل ہی میں رہ جائے گی وہ آرزو جو دل میں ہے

مدعائے عشق میرا کچھ نہیں جز ذوقِ عشق
حسن کو حیرت ہے یہ کس سعیِ بے حاصل میں ہے

اپنی شانِ بے نیازی پر تمھیں کیا کیا ہیں ناز
کاش تم اُس شوق کو جانو جو میرے دل میں ہے

بس یہی لے دے کے ہے اک یادگارِ عہدِ شوق
قدر کر اُس داغ کی وحشت جو میرے دل میں ہے

اشارہ کرتی ہے وہ چشمِ پُرخمار مجھے
کہ تجھ کو نقد کی حاجت ہو تو پکار مجھے

اگر چہ ہے ترے آنے کا انتظار مجھے
نہ ہونے دے گی مری یاس بے قرار مجھے

کہاں ہے جذبۂ توفیق ایک بار تو آئے
کیا ہے نفس نے شرمندہ بار بار مجھے

میں کیا کہوں چمن آرائیاں تصور کی
ق خیالِ یار ہے گویا وصالِ یار مجھے

ہر اک طرف نظر آتا ہے جلوۂ دیدار
ہر ایک سمت سے آتی ہے بوئے یار مجھے

عذابِ روح ہے طولِ کلام بھی وحشت
اسی سبب سے ہے مرغوب اختصار مجھے

تاثیر ہم نہ مانیں گے آہِ سحر میں ہے — حیف اُس ہوس پہ ہے جو ہوائے اثر میں ہے
شاید بیان ہو تپشِ دل سے میری آج — عبرت کی داستان جو رقصِ شرر میں ہے
آوارگی سے میری ہے قائم جہانِ عشق — وہ عیب مجھ میں ہے کہ جو داخل ہنر میں ہے
مجبور ہے مگر نہیں مایوس دل مرا — بے بال و پر ابھی ہوسِ بال و پر میں ہے
ہرچند بیچ میں ہے ترا پردۂ حجاب — جلوہ ترے جمال کا میری نظر میں ہے
اُٹھتا ہے آج کون تری بزمِ ناز سے — باقی ہے مجھ میں دم نہ تو شمعِ سحر میں ہے

پھوڑا ہے آج وحشتِ شوریدہ سر نے سر
رنگینیِ چمن ترے دیوار و در میں ہے

یہی ہے عشق کی مشکل تو مشکل آساں ہے — ملا ہے درد وہ دل کو جو راحتِ جاں ہے
تری نگاہ سمجھتی ہے یا نہیں ، دیکھوں — لبِ خموش میں کوئی سوال پنہاں ہے
چمن قتیلِ جفائے خزاں کبھی ہے ، کبھی — ہلاکِ گرمیِ ہنگامۂ بہاراں ہے
نہیں ہوائے رہائی میں اس کی بیتابی — اگر قفس میں اسیرِ قفس پَرافشاں ہیں
مراد ذوقِ خرابی کی اب بر آئے گی — کہ دل کی تاک میں وہ چشمِ فتنہ ساماں ہے
فراخ حوصلگی پر جنوں کی شاہد ہے — وہ ایک چاک جو دامن سے تا گریباں ہے
تری نظر نہ کہیں تاڑ جائے صورت سے — دلِ فریفتہ محوِ نشاطِ پنہاں ہے
یہ بے خودی ہے مرے عیشِ زندگی کی کفیل — نگاہِ شوق ابھی محوِ روئے جاناں ہے
خدا کرے کہ میسر نہ آئے زاہد کو — نشاطِ بادہ کہ ایمانِ مے پرستاں ہے
بلاکشوں کی دعا ہے کہ اے خدا نہ مٹے — جگر کا داغ کہ چشم و چراغِ ہجراں ہے

ہوا ہے شوقِ سخن دل میں موج زن وحشت
کہ ہمصفیر مرا رعب سا سخنداں ہے

حکیم محمد علی رعب مرحوم شاہ آبادی جو کئی سال کلکتہ میں مقیم رہے۔ ترانۂ وحشت، صفحہ 89

ہر وقت کی خلش مجھے بے حس جو کر گئی — ہے ہے وہ دل خراشیِ زخمِ جگر گئی
دو دن رہی بہارِ چمن پھر گزر گئی — شورش تری نہ بلبلِ شوریدہ سر گئی
منظور تھا مشاہدۂ شاہدِ جمال — دیکھا اُسی کو اپنی جہاں تک نظر گئی
حسرت گناہ کی بھی تو پوری نہ ہو سکی — دو دن کی زندگی مجھے بدنام کر گئی
افسردگی نتیجۂ جوش و خروش ہے — تاثیر نالۂ شب و آہِ سحر گئی
کیا یاس نے علاج کیا اضطراب کا — شکرِ خدا کہ اپنی طبیعت ٹھہر گئی
ٹوٹا مثالِ توبۂ رنداں غرورِ شیخ — تیری نگاہِ ناز بھی کیا کام کر گئی
وہ آنسوؤں کی پہلی سی طغیانیاں کہاں — ندّی کی ہے مثال کہ چڑھ کر اُتر گئی
اے مستِ جامِ حسن، تجھے کچھ خبر بھی ہے — تیری زلف کی مجھے بے ہوش کر گئی
پیغامِ گل پہ نکلی اسیرِ قفس کی روح — بلبلِ چمن میں بے مدد بال و پر گئی
اتنی ہی ہے اگر ہے خبر کچھ بہار کی — آئی تھی بوئے گل مجھے بے ہوش کر گئی

دلِ خرد نے اب بھی اُڑائی جنوں کی چال
قدرِ کمالِ وحشتِ شوریدہ سر گئی

بگڑتے ہو جو سُن کر تم مری تقریرِ بیتابی — بتاؤ بھی تو کچھ آخر مری تدبیرِ بیتابی
دمِ عرضِ تمنا ضبط سے گو کام لیتا تھا — نمایاں تھی مری صورت سے اک تصویرِ بیتابی
عبث تم بھی اُلجھتے ہو ہمارا حالِ دل سُن کر — کوئی تقریر میں تقریر ہے تقریرِ بیتابی
یہ اندازِ تغافل کس لیے مدِّ نظر ٹھہرا — بُری لگتی ہے جب تم کو مری تقصیرِ بیتابی
اُنھیں کیا چھیڑنا مقصود ہے اے اضطرابِ دل — نگاہِ گرم سے کرتے ہیں وہ تعذیرِ بیتابی
پیام و نامہ اپنے دونوں کے دونوں ہیں بے معنی — وہ ہے تقریرِ بیتابی، یہ ہے تحریرِ بیتابی
نمائش ہے انھیں منظور اپنے شانِ تمکیں کی — ذرا اُٹھ کر خبر لے اُن کی اے تاثیرِ بیتابی
تعلق کیا دل و دیوانہ کو صبر و تحمل سے — حیا اُن کی مگر ہوتی ہے دامن گیرِ بیتابی

خیالِ نکتہ پردازی کہاں اور میں کہاں وحشت
غزل اپنی ہے اک اُلجھی ہوئی تقریرِ بیتابی

نفس سینے میں تیرے ہر نفس فریاد کرتا ہے
رواں ہے کارواں یعنی جرس فریاد کرتا ہے

اسیرِ بے زباں ہوں نالہ و فریاد کیا جانوں
خموشی دیکھ کر میری قفس فریاد کرتا ہے

گل و گلزار سے کیا کام مجھ آلودہ دامن کو
کہ نزدیکی سے میری خار و خس فریاد کرتا ہے

کہیں دیکھی بھی ہے اس جبہ غفلت قافلے والو
کہ ہم ہیں نیند کے ماتے جرس فریاد کرتا ہے

نہ دے وحشت تو ہر محفل میں تکلیفِ سخن ہم کو
بہت نازک ہے فکرِ نکتہ رس فریاد کرتا ہے

خدا جانے کسے یہ دیدۂ تر یاد کرتا ہے
کہ ساتھ اس کے دلِ بیتاب بھی فریاد کرتا ہے

رہی باقی نہ کچھ بھی تجھ سے گو امید ملنے کی
دلِ مایوس پھر بھی تجھ کو اکثر یاد کرتا ہے

دلِ وحشی پریشاں طرۂ گیسو پریشاں تر
وطن آوارہ گھر کو اور اسے گھر یاد کرتا ہے

سرِ شوریدہ کو کافی نہیں دیوار زنداں کی
کہ ذوقِ سنگِ طفلاں کو مکرر یاد کرتا ہے

تری عاشق فراموشی کی گو حد ہوگئی ظالم
ترا وحشت تجھے اس پر بھی اکثر یاد کرتا ہے

جو تجھ سے ہوسکے تو کام اتنا چشمِ تر کردے
کہ دردِ دل کی اس کو پردے پردے میں خبر کردے

اک آہ ناتواں کافی ہے شرحِ قصۂ غم کو
حکایت تیری طولانی ہے اے دل مختصر کردے

شکایت میں کروں کس منہ سے اس کے تیرِ مژگاں کی
مجھے بیتاب اگر خود خواہشِ زخمِ جگر کردے

نہ ہو اندوہ سے اندوہ گیں، ہے عیش گر مقصد
امید صبحِ عشرت میں شبِ غم کو بسر کردے

بقدرِ کامیابی بڑھتی جاتی ہے ہوس تیری
نہ اتنا بھی رگڑ صندل کہ دو نا دردِ سر کردے

ہے اک مخصوص مقصد زندگی کا، یہ نہیں غافل
کہ اپنی عمر کو تو جس طرح چاہے بسر کردے

گراں ہوتا ہے طبعِ شعر کو طولِ سخن وحشت
اگر پُر لطف رکھنا ہے غزل کو، مختصر کردے

یقینِ نامرادی پر بھی ہے حالت سے وہی دل کی
تمھیں سے چاہتا ہوں داد اپنے سعیِ باطل کی

توجہ کے جو قابل ہو حقیقت کیا مرے دل کی
تری برقِ نظر کو جستجو ہے کس کے حاصل کی

کیا ہے مجھ کو بے حس تو نے اے افسردگی دل کی
نہ غم ہے بُعدِ منزل کا نہ عشرت قربِ منزل کی

کہا کس نے تجھے اے شوق پابندِ ادب ہو جا
یہی آخر ہوا دل میں تمنا رہ گئی دل کی

تلاطم تھا بہت موجیں بہا کر لے گئیں مجھ کو
وگرنہ آرزو تھی کس خرد دشمن کو ساحل کی

مری ہستی کی کیا ہستی مگر اے دیدۂ بینش
ذرا رنگینیاں تو دیکھنا اس نقشِ باطل کی

قدم اُٹھتا ہے بیتابانہ، نظریں بھی پریشاں ہیں
خبر دیتی ہے خود بیتابیِ دل قربِ منزل کی

بچانا چشمِ بد سے اے خدا اُس شمعِ محفل کو
نظر پڑتی ہے اُس پر ہر طرف سے اہلِ محفل کی

ہمارا نالۂ موزوں ہے جس کو شعر کہتے ہیں
غزل کی شکل میں ہوتی ہے وحشت گفتگو دل کی

چشم کو میں نے بہر سو نگراں دیکھا ہے
نہیں معلوم ترا جلوہ کہاں دیکھا ہے

دل پھنکا جاتا ہے یہ آگ کدھر سے اُٹھی
نام معلوم نہیں جس کا نشاں دیکھا ہے

نظر آیا نہیں جلوہ ترا کیوں کر کہیے
دیدۂ دل تو یہ کہتا ہے کہ ہاں دیکھا ہے

آہِ سوزاں نہیں غیر از اثرِ گرمیِ شوق
متصل آگ بھی ہوگی جو دھواں دیکھا ہے

شرم ہے ایک ادا ورنہ تری آنکھوں میں
ہم نے اک میکدۂ شوق نہاں دیکھا ہے

جس کی طفلی کا زمانہ تھا قیامت انگیز
چشمِ بدور اُسے آج جواں دیکھا ہے

ہو نہ ہو حضرتِ وحشت کا ہے دولت خانہ
شہرِ الفت میں اک اجڑا سا مکاں دیکھا ہے

ہجومِ اشتیاقِ دید سے دیدار مشکل ہے
نگاہِ منتظر کو شکوۂ بے تابیِ دل ہے

عجب نعمت ہے سوزِ عشق بھی جس کو میسر ہو
نہ جل سکتا ہے جو دل وہ جلا دینے کے قابل ہے

جگر کاوی ہماری موجبِ لذت ہے یاروں کو
گدازِ شمعِ محفل، باعثِ گرمیِ محفل ہے

بگڑ جاتے ہیں اپنے کام سارے تو بگڑ جائیں
طبیعت کو ہر ان الوقت کی تقلید مشکل ہے

وہی مطلوب ہو دل کو کہ جس سے ہو زیاں میرا
مری ترکیب میں اک جزوِ بربادی بھی شامل ہے

ہٹا دے عشق کی گرمی الٰہی اس رکاوٹ کو
کہ میرے سامنے دیوارِ حیرت ایک حائل ہے

سخن دانی تری تسلیم ہے وحشت ہمیں لیکن
کمالِ فن کا دعویٰ ہے اگر تجھ کو تو باطل ہے

دلِ ہنگامہ خو ہے اور ہجومِ صد تمنا ہے
نہیں کھلتا کہ آخر خاص اس کا مدعا کیا ہے

نہیں اک ذرّہ بھی عالم میں جہد و جہد سے خالی
کشاکشِ سعی کی ہے عام، گویا سب کو سودا ہے

تلاشِ آخر ہے کس کے باعثِ محبّتِ عالم
سمجھ میں ہی نہیں آتا الٰہی ماجرا کیا ہے

جہاں کی دلفریبی ہائے گوناگوں کا کیا کہنا
مگر جب غور سے دیکھو تو ہر نقش ایک دھوکا ہے

اُسی کا حق ہے جو ثابت کرے حق زورِ بازو سے
یہ لفظِ دلفریبِ خلقِ معنی سے معرّیٰ ہے

ضعیف از بسکہ ہے بنیادِ فرقِ امتیازی کی
بہت مشکل ہے کہنا کون ادنیٰ کون اعلیٰ ہے

جبینِ شوق ہے اور سجدۂ محرابِ دل وحشت
یہ کس کا گوشۂ ابرو نجانے کارفرما ہے

خدا کے واسطے یہ کیا ستم صیاد کرتا ہے
گرفتارِ وفا کو بھی کوئی آزاد کرتا ہے

نہیں ہے ظرف ہر دیوانے کا اس گنج کے لائق
خوشا وہ دل کہ تیرا غم جسے آباد کرتا ہے

نہ کہہ اُلفت میں ناصح عقل سے تو کام لینے کو
کہ یہ سودا تو پہلے عقل کو برباد کرتا ہے

عجب کیفیتیں ہوتی ہیں تنہائی کے عالم میں
کہ عہدِ رفتہ کا افسانہ جب دل یاد کرتا ہے

خدا سرسبز رکھے تجھ کو وحشت باغِ عالم میں
تو کیا کیا طرزِ فنِ شعر میں ایجاد کرتا ہے

نہیں کہ عشق نہیں ہے گل و سمن سے مجھے ‏ ‏ ‏ دلِ فسردہ لیے جاتا ہے چمن سے مجھے
مثالِ شمع ہے رونا بھی اور جلنا بھی ‏ ‏ ‏ یہی تو فائدہ ہے تیری انجمن سے مجھے
بڑھی ہے یاس سے کچھ ایسی وحشتِ خاطر ‏ ‏ ‏ نکال کر ہی رہے گی یہ اب وطن سے مجھے
عزیز اگر نہیں رکھتا، نہ رکھ، ذلیل ہی رکھ ‏ ‏ ‏ مگر نکال نہ تو اپنی انجمن سے مجھے
وطن سمجھنے لگا ہوں میں دشتِ غربت کو ‏ ‏ ‏ زمانہ ہوگیا نکلے ہوئے وطن سے مجھے
مرے بھی داغِ جگر مثلِ لالہ ہیں رنگیں ‏ ‏ ‏ ہے چشمک اُس گلِ خوبی کے بانکپن سے مجھے
چھپا نہ گوشہ نشینی سے رازِ دلِ وحشت
کہ جانتا ہے زمانہ مرے سخن سے مجھے

کسی کو کیا پڑی ہے جو کسی کا مدعا جانے ‏ ‏ ‏ دلِ بیتاب کی تسکین کب ہوگی خدا جانے
برابر چھیڑ رہتی ہے دلِ دیوانہ سے مجھ سے ‏ ‏ ‏ نہ میں اس کی دوا جانوں نہ وہ میری دوا جانے
ہماری آرزومندی کو پوچھا اپنے تغافل سے ‏ ‏ ‏ وفائیں ہم نے کی ہیں یا نہیں تیری جفا جانے
نہ گھبرا تو مرے آفت طلب دل کی خرابی سے ‏ ‏ ‏ یہ وہ درد آشنا ہے درد کو بھی جو دوا جانے
نہیں محفل میں واقف کوئی میرے سوزِ پنہاں سے ‏ ‏ ‏ اگر جانے تو شاید وہ نگاہِ آشنا جانے
وہ دل یارب نہ ہو ذوق آشنا لطفِ اسیری سے ‏ ‏ ‏ سوادِ گیسوئے دلبر کو جو شامِ بلا جانے
یہاں تو دوستو سے بے بنے بولے نہیں بنتی
گزرتی رہتی ہے جو دل پہ وحشت کوئی کیا جانے

پوشیدہ دیکھتی ہے کسی کی نظر مجھے ‏ ‏ ‏ دیکھ اے نگاہِ شوق تو رسوا نہ کر مجھے
مقصد سے بے نیاز رہا ذوقِ جستجو ‏ ‏ ‏ میں بے خبر ہوا جو ہوئی کچھ خبر مجھے
میں شب کی بزمِ عیش کا ماتم نشیں ہوں آپ ‏ ‏ ‏ رو رو کے کیوں رُلاتی ہے شمعِ سحر مجھے
حیرت نے میری آئینہ اُن کو بنا دیا ‏ ‏ ‏ کیا دیکھتے کہ رہ گئے وہ دیکھ کر مجھے
قربان جاؤں چھوڑ تکلف کی گفتگو
کہہ کر پکار وحشتِ شوریدہ سر مجھے

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

کسی دن ہم جو شرحِ واقعاتِ آشیاں کرتے
تو ذکرِ مہربانیہائے برق و باغباں کرتے

ہماری دور بینی ہے ہمارے امن کی دشمن
نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے

پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں
کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے

یقیں آیا نہ جب تجھ کو ہماری جاں نثاری کا
بتا کب تک ترا ہم اعتبار او بدگماں کرتے

رہے ہم بے خبر دیر و حرم کی دلفریبی سے
بغیر از خانۂ دل جستجو تیری کہاں کرتے

حرم میں بھی جب اپنے ساتھ تھی قسمت کی محرومی
تو ہم کس منہ سے آخر شکوۂ جورِ بتاں کرتے

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

اگر کچھ التفاتِ ناز ہوتا حوصلہ افزا
تو شرحِ آرزو ہم داستاں در داستاں کرتے

ذرا جاتا تھا اپنا دل کسی کے لطفِ پیہم سے
بہاریں ہم نے دیکھی تھیں نہ کیوں خوفِ خزاں کرتے

وفاداری کا دعویٰ مستند ہوتا تو بہتر تھا
ہمارا امتحاں تم ، ہم تمھارا امتحاں کرتے

رہا ناگفتہ ہی افسانہ اپنے شوقِ بے حد کا
بیاں جو ہو نہیں سکتا تھا اس کو کیا بیاں کرتے

قفس میں پَرفشانی کا نتیجہ تھا پشیمانی
بجز آہ و فغاں کیا اور ہم سے ناتواں کرتے

نظر سے ہم نے دیکھے تھے بہت آثارِ بربادی
چمن میں اب دھرا کیا تھا جو پروائے خزاں کرتے

نہ پروا کی ہمارے کارواں نے جب تو پھر ہم ہی
بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے

حرم کیا دیر کیا یکساں کشش ہے سارے عالم میں
خدائی جمع ہوتی خود نمائی تم جہاں کرتے

کیا موقوف ہم نے قصۂ دردِ نہاں وحشت
کہاں تک خامۂ حسرت رقم کو خونچکاں کرتے

حزیں اگر چہ ہے دل ذوقِ انتظار بھی ہے　　یہ ناامید کسی کا امیدوار بھی ہے
ہر ایک بات پہ مشکل ہے عذرِ مجبوری　　کہ آدمی کو بظاہر کچھ اختیار بھی ہے
فریب کھاؤں نہ کیوں کر طلسمِ ہستی کا　　خزاں کا دور بھی ہے موسمِ بہار بھی ہے
اگر چہ خستۂ حورِ فلک ہوں، پر صد شکر　　دلِ ستم زدہ مجروحِ تیرِ یار بھی ہے
جہانِ عشق ہے اک لازوال میخانہ　　سرورِ نشہ بھی ہے، تلخیِ خمار بھی ہے
رکے تو کیسے رکے کارِ عشق دنیا میں　　کہ ہجرِ یار میں امیدِ وصلِ یار بھی ہے
ڈرو نہ دینے سے الزام تم مرے دل کو　　گناہ اگر ہے وفا تو گناہگار بھی ہے
یہی نہیں ہے کہ دل ہے بلاکشِ ہجراں　　فریب خوردۂ امیدِ وصلِ یار بھی ہے

نجات ہوگی نہ ایسے کہ دام سے وحشت
کہ بے وفا بھی ہے اور پھر وفا شعار بھی ہے

ایک پر ایک کی حالت کا اثر ہوتا ہے　　دل تڑپتا ہے تو مجروح جگر ہوتا ہے
جذبۂ عشق کا آخر کچھ اثر ہوتا ہے　　یوں بظاہر نہ ہو محسوس، مگر ہوتا ہے
طور دیکھے ہیں زمانے کے ہمارے دل نے　　اب کہاں! اس میں تمنا کا گزر ہوتا ہے
کوئی پوچھے سببِ گریہ تو کہہ بھی نہ سکوں　　آخر اس شغل سے کیا دیدۂ تر ہوتا ہے
خلشِ زخم کے کیا کیا نہ مزے لیتا ہوں　　دل میں ڈوبا ہوا جب تیرِ نظر ہوتا ہے
دیدنی ہوتی ہے وہ کیفیتِ عرضِ نیاز　　آستاں پر ترے جس دم مرا سر ہوتا ہے

شعرگوئی کی توقع نہ رکھو وحشت سے
وہ کہاں مائلِ اظہارِ ہنر ہوتا ہے

یہ کیسی کثرتِ گل ہے یہ کیا رونق ہے گلشن کی
جگہ کاہے کو ہوگی اب یہاں میرے نشیمن کی

تماشا ہوگئی سحر آفرینی چشمِ پُرفن کی
ہوئی ہے ایک حالت بزم میں شیخ و برہمن کی

جگر لاؤں کہاں سے میں جو تاراجِ خزاں دیکھوں
انھیں آنکھوں سے کل رنگینیاں دیکھی ہیں گلشن کی

قفس کے رہنے والوں کیا کوئی خوابِ پریشاں تھا
کہ آنکھوں میں یکا یک پھر گئی تصویرِ گلشن کی

ہماری تیرہ بختی سے کبھی ایسا نہ دن آیا
کہ اپنی شام منت کش ہو اس کے روئے روشن کی

لٹے اک بار ہم ایسے کہ آنکھیں کھل گئیں اپنی
ہماری رہبرِ منزل بنی تائید رہزن کی

بہار آئی تو کیا دیکھی ہے چشمِ باغباں میں نے
نظر آتی نہیں ہے خیر اب اپنے نشیمن کی

گریباں کا مرے قصہ طلب ہے چاکِ ناکامی
گلِ مقصود سے زینت ہوئی ہے کس کے دامن کی

نہ میں بیگانۂ گلشن نہ گلشن مجھ سے بیگانہ
خدا جانے ہوئی کیا وجہِ بربادی نشیمن کی

نہ ہو دستِ جنوں تو کون پُرساں ہو گریباں کا
نہ لے وحشت خبر تو سخت رُسوائی ہے دامن کی

وہ حسنِ خودنما مستور ہو کر اور چمکا ہے
بنی ہے نور کی چادر یہ کیفیت ہے چلمن کی

خدا جانے نکل کر بات منہ سے شکل کیا پکڑے
طبیعت دوست کی نازک، شکایت کیا ہو دشمن کی

یہاں تو تندہی درکار ہے اور حیف اے غافل
جہانِ کار میں مطلوب آسائش تجھے تن کی

وہی دو چار دن تھے زندگی میں شادمانی کے
کہاں اے عمرِ رفتہ! اب وہ بےفکری لڑکپن کی

مبارک نغمۂ مطرب اُنھیں، اُن کی بلا جانے
صدائیں آرہی ہیں دشتِ غم سے کس کے شیون کی

نکال اے جذبۂ توفیق مجھ کو دشتِ ظلمت سے
ہدایت پر چلا چلتا ہوں ہر دم نفسِ رہزن کی

دکھائے ہیں غزل میں آج کچھ جوہر طبیعت کے
طلب کرتا ہوں اہلِ فن سے وحشت داد میں فن کی

شب و روز ایک حالت ہے مرے دلِ تپاں کی — اُسے جستجو ہے کس کی اسے فکر ہے کہاں کی
مرے صبر کی الٰہی کوئی حد نہ ہو تو بہتر — کوئی انتہا نہیں جب ستمِ ستمگراں کی
سرِ شاخِ آشیاں بھی مجھے خوف تھا قفس کا — نہ ہوئی نصیب دل کو کبھی راحت آشیاں کی
جو ہے اتنی بیقراری تو تڑپ کے جان دے دے — انھیں ہوتے ہوتے ہوگی خبر اپنے نیم جاں کی
مجھے ہمنوا نہ دینا کہیں زحمتِ تکلم — کہی جائے گی قفس میں نہ حکایت آشیاں کی
مری بے قراریوں کا ہے سبب ترا تغافل — تری بے رُخی ہے سُرخی مرے دل کی داستاں کی
مجھے اب شگفتگی کی ہو قفس میں کیا توقع — گئی ساتھ آشیاں کے جو تھی بات آشیاں کی

نہیں اہلِ فن میں وحشت مجھے ایک سے بھی چشمک
کہ ہے قدر میرے دل میں شعرائے نکتہ داں کی

آنکھ میں جلوہ ترا دل میں تری یاد رہے — یہ میسر ہو تو پھر کیوں کوئی ناشاد رہے
اس زمانے میں خموشی سے نکلتا نہیں کام — نالہ پُرشور ہو اور زوروں پہ فریاد رہے
درد کا کچھ تو ہو احساس دلِ انساں میں — سخت ناشاد ہے، دائم جو یہاں شاد رہے
اے ترے دامِ محبت کے دل و جاں صدقے — شکر ہے قیدِ علائق سے ہم آزاد رہے
نالہ ایسا ہو کہ ہو اس پہ گمانِ نغمہ — رہے اس طرح اگر شکوۂ بیداد رہے
ہر طرف دام بچھائے ہیں ہوس نے کیا کیا — کیا یہ ممکن ہے یہاں کوئی دل آزاد رہے
جب یہ عالم ہو کہ منڈلاتی ہو ہر سمت کو برق — کیوں کوئی نوحہ گرِ خرمنِ برباد رہے

اب تصور میں کہاں شکلِ تمنا وحشت
جس کو مدت سے نہ دیکھا ہو وہ کیا یاد رہے

رہِ محبت میں جز محبت مرا کوئی مدّعا نہیں ہے
نظر چراتے ہو مجھ سے کیوں تم مری کوئی التجا نہیں ہے

ہوا میں زورِ کشش نہیں ہے گلوں میں بوئے وفا نہیں ہے
سبھی ہیں بیگانہ اس چمن میں کوئی یہاں آشنا نہیں ہے

نہ زحمتِ فکرِ چارہ سازی نہ بارِ احسانِ چارہ سازاں
ملا ہے قسمت سے تجھ کو اے دل وہ درد جس کی دوا نہیں ہے

ادھر وہی ہے نیاز مندی ادھر وہی شیوۂ تغافل
ہوئے ہیں وہ بے نیاز ایسے کہ جیسے میرا خدا نہیں ہے

حریفِ اندازِ بے نیازی بنا ہوں اس شوخ نازنیں کا
زبان پر مدّعا نہیں ہے نگاہ میں التجا نہیں ہے

وہی ہے بزمِ نیاز منداں جہاں کی ہے رسم جانفشانی
وہی ہے بازارِ دلستاناں جہاں متاعِ وفا نہیں ہے

کہاں سے ہو خواہشِ تکلم بجا ہے وحشت تری خموشی
کوئی ترا ہم نفس نہیں ہے کوئی ترا ہم نوا نہیں ہے

نالوں سے اگر میں نے کبھی کام لیا ہے
خود ہی اثرِ نالہ نے دل تھام لیا ہے

آزادیِ اندوہ فزا سے ہے رہائی
اب میں نے کچھ آرام حبسِ دام لیا ہے

اُٹھتی تھیں اُمنگیں انھیں بڑھنے نہ دیا پھر
میں نے دلِ ناکام سے اک کام لیا ہے

جز مشغلۂ نالہ و فریاد نہ تھا کچھ
جو کام کہ دل سے سحر و شام لیا ہے

خود پوچھ لو تم اپنی نگاہوں سے وہ کیا تھا
جو تم نے دیا میں نے وہ پیغام لیا ہے

غم کیسے غلط کرتے جدائی میں تری ہم
ڈھونڈا ہے تجھے ہاتھ میں جب جام لیا ہے

آرام کے اب نام سے میں ڈرنے لگا ہوں
تکلیف اُٹھائی ہے جب آرام لیا ہے

معلوم اُنھیں خوب ہے جو واقفِ فن ہیں
وحشت نے محاکات سے کیا کام لیا ہے

تعجب کیا اگر میری پریشانی نہیں جاتی — کہ میں مشکل میں ہوں اور فکرِ آسانی نہیں جاتی
حصولِ آرزو کی دل میں یہ امید کیسی ہے — میں کیوں کر مانوں ایسی بات جو مانی نہیں جاتی
ہوا ہوں تیری پیہم بے رُخی سے اس قدر بے حس — کہ اُلفت کی نظر بھی اب تو پہچانی نہیں جاتی
بہار آئی بھی رخصت بھی ہوئی صحنِ گلستاں سے — ترے وحشی کی لیکن چاک دامانی نہیں جاتی
نہ جانے کیا نظارہ پیش کرتا ہے جمال اُس کا — کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور حیرانی نہیں جاتی
ہوا سرزد یہ کیسا جرم مجھ سے راہِ الفت میں — کہ بعد از عفو بھی میری پشیمانی نہیں جاتی
نہ سمجھے تیرے تیور ہی نہ اپنا حال ہی دیکھے — دلِ ناداں وہی ہے اس کی نادانی نہیں جاتی

کروں کیا ، ہے تقاضائے دلِ حسن آشنا وحشت
غزل گوئی نہیں چھٹتی ، غزل خوانی نہیں جاتی

یہ رابطہ ظاہر داری کا کیوں مجھ کو دکھایا جاتا ہے — وہ مجھ سے نہیں ہے پوشیدہ جو مجھ سے چھپایا جاتا ہے
کیا اس کی مشیّت کی حکمت، کیا اپنی ہے وجہِ ناکامی — ہوں اس کے سمجھنے سے قاصر جو مجھ کو بتایا جاتا ہے
آسان مٹانا اس کا نہیں مٹتے ہی مٹے گا نقشِ امید — کل پھر وہ بنایا جائے گا جو آج مٹایا جاتا ہے
تقدیر کا ہر دن رونا ہے یعنی کہ چراغ ارمانوں کا — ہر روز جلایا جاتا ہے ہر روز بجھایا جاتا ہے
اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو بھی حیرت ہوتی ہے — جو بار اُٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے
یہ بھی ہے تماشا اُلفت کا جو بات ہے وہ نادانی کی — منظور نہیں ہے ربط جنھیں ربط اُن سے بڑھایا جاتا ہے

جب شعر و سخن سے وحشت کو باقی نہ رہی ہو دلچسپی
حیران ہوں کیوں پھر محفل میں یہ شخص بلایا جاتا ہے

طبیعت یاس کی جانب جو مائل ہوتی جاتی ہے
دلِ بیتاب کو تسکین حاصل ہوتی جاتی ہے

امید افزا نہیں نقشِ امید اپنا تو کیا حاصل
یہ تحریر اب مٹا دینے کے قابل ہوتی جاتی ہے

مجھے دشواریاں دینے لگیں پیغامِ آسانی
مری مشکل نویدِ حلِ مشکل ہوتی جاتی ہے

عجب کیا ہے کہ چکنا چور ہو ٹکرا کے ساحل سے
مری کشتی جواب نزدیکِ ساحل ہوتی جاتی ہے

امید افزا ہوئی ہے خستگی حد سے سوا ہو کر
تھکن میری دلیلِ قربِ منزل ہوتی جاتی ہے

دلِ دیوانہ کرتا ہے در و دیوار سے باتیں
مری خلوت نہیں ہے یہ تو محفل ہوتی جاتی ہے

نیازِ عشق بڑھتا جا رہا ہے جس قدر میرا
تری شمشیرِ ناز اتنی ہی قاتل ہوتی جاتی ہے

ترقی دی غزل کو وحشتِ رنگیں طبیعت نے
نشاط انگیز اہلِ فن کی محفل ہوتی جاتی ہے

باقی ہے یادِ شوکتِ عہدِ کہن ابھی
موجود اپنی وضع میں ہے بانکپن ابھی

کیوں ہو خیالِ شکوۂ جورِ خزاں مجھے
بھولی نہیں ہے یادِ بہارِ چمن ابھی

گو آ پڑا ہے شامِ غریبی سے سابقہ
پیشِ نظر ہے شوکتِ صبحِ وطن ابھی

کچھ لطف اٹھاؤں زندگیِ مستعار کا
حاصل ہے مجھ کو فرصتِ سیرِ چمن ابھی

خوں ریزیوں سے گرمیِ بازارِ حسن ہے
کیوں کم ہو ان کی دل کشیِ انجمن ابھی

جدّت پسندیوں کی طرف رُخ کروں گا کیا
اُترا نہیں ہے نشۂ جامِ کہن ابھی

بہتر ہے یہ کہ پوچھے نہ وحشت سے کوئی اب
کیسا ہے رنگِ محفلِ شعر و سخن ابھی

آخری غزل 1

جو زندگی میں ہمیں کچھ امید ہی نہ رہی
تو زندگی ہی ہماری رہی رہی نہ رہی

دلِ فسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا
کہ دہر میں کوئی شے وجہِ دلکشی نہ رہی

مقامِ شکر ہے اک ایسا وقت آ پہنچا
کہ دل کے حال سے خود دل کو آگہی نہ رہی

بہت خودی نے خدائی میں سر اُٹھایا تھا
کہ بیخودی کا ہے احسان وہ خودی نہ رہی

غلط ہے دوں جو گلستانِ دہر کو الزام
جب اپنے غنچۂ خاطر میں تازگی نہ رہی

یہ کیا ضرور ہے رودوں میں عیشِ رفتہ کو
بُرا ہی کیا ہے جو لب پر ترے ہنسی نہ رہی

یہ کس کی جلوہ نمائی ہے بزمِ وحشت میں
بقولِ میر " چراغوں میں روشنی نہ رہی"

1 مندرجہ بالا غزل وحشت کی آخری غزل ہے۔ یہ انھوں نے مارچ 1955ء میں کلکتہ کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ موصوف نے اس غزل کا قلمی نسخہ انھیں دنوں اپنے دستِ خاص سے حضرتِ امیر الاسلام شرقی ساکن ڈھاکہ کو عنایت کا تھا" (صفحہ 165 "حیاتِ وحشت" از وفا راشدی)

ماتمِ آرزو

رحمت خدا کی تجھ پہ ہو ناکامِ آرزو　　اے خاطرِ ستم کشِ ایامِ آرزو
آہ اے فریب خوردہ ٔ نقشِ امید آہ　　کیا کیا تری ہوس نے نہ تجھ کو کیا تباہ
طولِ امل کے دام میں تو پھنس کے رہ گیا　　افسوس بر نہ کوئی تیرا مدّعا ہوا
سب تیری زندگانی کا روشن ہے مجھ پہ حال　　معلوم خوب ہے ترا ہر عیب ہر کمال
طفلی ہی سے تو عیشِ خیالی میں مست تھا　　خوابِ مسرّتِ ابدی دیکھتا رہا
منصوبے باندھتا تھا ہزاروں مگر کبھی　　اے نامرادِ فکر و عمل ایک دم نہ کی
اوّل تو خواہشیں ہی تری بے شمار تھیں　　اور پھر نکلنے کے لئے سب بے قرار تھیں
آخر بنی نہ بات طلسمِ خیال کی　　یعنی فضول تھی طلب امرِ محال کی
معلوم کر سکا نہ تو اے بے خبر کبھی　　وہ کون شئے ہے جس کی ضرورت ہے واقعی
مقصد ترے جہان میں آنے سے کچھ تو تھا　　بے صرفہ تو نے عمر گذاری ، ستم کیا

ہاں کشتہ ٔ امید بجا کہہ رہا ہے تو
''اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو''

(انتخاب از دیوانِ وحشت)

رباعیات

تم وعدہ بھی کرتے ہو مکرتے بھی ہو　　تم آپ بگڑتے ہو سنورتے بھی ہو
عاشق سے جفا کے بعد کرتے ہو وفا　　کیا خوب ڈراتے بھی ہو ڈرتے بھی ہو

دل را چو سپرد کس بغارت گرِ خویش　　باید کہ گزارد سرِ خشک وتر خویش
زلفت وصل گفتوئے نکند　　تا در رہِ او ہی نہ بازد سرِ خویش

مجھ سے جو نہ ملتے وہ کوئی رات نہ تھی　　مجھ سے جو نہ کہتے وہ کوئی بات نہ تھی
بے گانگی اب انہوں نے ایسی برتی　　گویا کہ کبھی مجھ سے ملاقات نہ تھی

رنگین ہے جہان چمن طرازی دیکھو　　دل شاد ہے خلق، کار سازی دیکھو
مجھ پر بھی ہیں لطف اُس کے جاری　　یہ شان ۔ گناہگار نوازی دیکھو

گو اس سے طبیعت اپنی گھبراتی ہے　　توبہ شکنی وہی چلی جاتی ہے
بے توبہ مجھے بخش دے اے بارِ الٰہ　　اب توبہ تو کرتے ہوئے شرم آتی ہے

کتابیات

دیوانِ وحشت	رضا علی وحشت	ستارہ ہند پریس کلکتہ	1910
ترانۂ وحشت	رضا علی وحشت	مکتبہ جدید لاہور	1953
نقوش وافکار	رضا علی وحشت	مکتبہ عارفین ڈھاکہ	1975
مکاتیبِ وحشت	مرتب شمس الدین عازم	بزمِ شاکری کلکتہ	1960
مضامینِ وحشت	مرتب جمال احمد صدیقی	مغربی بنگال اردو اکادمی	1982
یادگارِ وحشت	مرتبہ اسحاق راشد	کلکتہ	1981
سوغات	مرتبہ اسد الزماں کلکتہ	مغربی بنگال اردو اکادمی	1981
حیاتِ وحشت	ڈاکٹر وفا راشدی	ڈھاکہ	1982
نساخ سے وحشت تک	سید لطیف الرحمٰن	مغربی بنگال اردو اکادمی	1988
وحشت حیات اور فن	معید رشیدی	عرشیہ پبلیکیشنز دہلی	2010
رسالہ مہر نیمروز	(وحشت نمبر)	کراچی	1957
رسالہ مغربی بنگال	(وحشت نمبر)	کلکتہ	1996

وحشت کلکتوی کو ان کے معاصرین نے 'غالب دوراں' اور 'غالب ثانی' وغیرہ قرار دیا۔ حسرت موہانی نے بھی ان کا شمار ان برگزیدہ شعرا میں کیا ہے جن کے حسن کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔ وحشت نے خود بھی کہی ہے:

وحشت ہمیں تتبعِ غالبؔ ہے آرزو
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

وحشت کی تاریخ پیدائش 18 نومبر 1881 ہے۔ ان کا داخلہ 1890 میں مدرسہ عالیہ کے بہرۂ انگریزی فارسی درجہ سوم میں کرا دیا گیا اور انھوں نے 1898 میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1927 میں اسلامیہ کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس کے شعبۂ اردو و فارسی کے اولین پروفیسر کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ تقسیم ہند میں ان کے خاندان پر بھی ہر جت کے بادل منڈلائے اور وہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) منتقل ہو گئے۔ دیوان وحشت 1910 میں شائع ہوا، جو ان کا پہلا دیوان تھا۔ ترانۂ وحشت 1953 میں شائع ہوا، جو ان کا دوسرا دیوان تھا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ بھی 'مضامین وحشت' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کا انتقال 20 جولائی 1956 کو ہوا اور ڈھاکہ میں ہی دفن کیے گئے۔

ان پر یہ مونوگراف کلیم حاذق نے تیار کیا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ادبی تحقیق و تنقید سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں ''آگہی گر نہیں'' 2003 اور ''رگ سنگ'' 2012 قابل ذکر ہیں۔ انھیں ساہتیہ اکادمی کا انعام برائے ترجمہ مل چکا ہے۔

ISBN 978-93-5160-108-1
ISBN 935160108-0
9 789351 601081
NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

₹ 82.00